# علم اور اخلاص نیت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ علم جس سے اللہ کی رضا چاہی جاتی ہے (یعنی دین اور کتاب وسنت کا علم)، اگر اس کو کوئی شخص دنیا کی دولت کمانے کے لیے حاصل کرے تو وہ قیامت میں جنت کی خوشبو سے محروم رہے گا۔''

(ابوداوٗد، ابن ماجہ ومسند احمد)

فائدہ:

جس طرح ہر جاندار کی روح ہوتی ہے اسی طرح عبادت کی روح اخلاص ہے، بغیر روح کے جاندار مردہ اور بغیر اخلاص کے عبادت غیر مقبول ہے، بغیر اخلاص کے عمل خواہ کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو بے اثر ہے، قرآن وحدیث میں تدبر کرنے سے اخلاص کی اہمیت باآسانی واضح ہوجاتی ہے۔ مسلمان کی نظر میں اخلاص نیت کا معاملہ دینی ودنیاوی امور میں انتہائی اہمیت رکھتا ہے، اس لیے کہ سب اعمال اسی کی بنیاد پر سرزد ہوتے ہیں اور اسی کے اعتبار سے وہ درست یا غلط قرار پاتے ہیں۔

لہذا ضروری ہے کہ ہر عمل شروع کرنے سے پہلے انسان اپنی نیت کو پرکھ لے اور اسے اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرلے تاکہ وہ عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوکر رضائے الٰہی کا سبب بن سکے اور اس بندے کے لیے جس نے وہ عمل کیا ہے اجر وثواب کا باعث بنے۔

اخلاص کی اہمیت پر قرآن وحدیث میں متعدد دلائل موجود ہیں اور محدثین نے اپنی تصانیف میں اخلاص کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اخلاص پر دلالت کرنے والی احادیث آغاز ہی میں ذکر کی ہیں تاکہ عالم یا طالب علم ابتداء ہی سے اپنی نیت کی اصلاح کرلے، کیونکہ بغیر اخلاص نیت کے علم تو حاصل ہوگا مگر جو مقصد رضائے الٰہی ہے اس سے محروم رہے گا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿خبردار! عبادت خالص اللہ ہی کے لیے ہے۔﴾ (الزمر ۳)

یعنی یہ اسی اخلاص عبادت کی تاکید ہے، جس کا ذکر قرآن وحدیث میں بہت سے مقامات پر آیا ہے، اخلاص اپنے رب کے ساتھ مضبوط تعلق اور سچی محبت کی دلیل ہے ایک مخلص بندہ اپنی تمام عبادات اور معاملات اپنے خالق ومالک کے لیے خالص کردیتا ہے اور درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی اس لائق ہے کہ اس کے لیے اپنے اعمال خالص کیے جائیں اور اس سے سچی محبت کی جائے۔

اب جو شخص علم دین محض اس لیے حاصل کرے کہ اس کے ذریعہ دنیا کی دولت وعزت سمیٹے اور اسے حصول دنیا کے لیے وسیلہ بنائے تو اس کے لیے حدیث مبارکہ میں سخت وعید بیان فرمائی گئی ہے۔

البتہ اگر علم دینی نہ ہو دنیاوی ہو تو اس کو اس مقصد کے لے کہ اسے حصول دنیا کے لیے وسیلہ اور ذریعہ معاش بنالیا جائے گا حاصل کرنا کوئی برا نہیں ہے لیکن اس میں بھی یہ شرط ہے کہ وہ علم ایسا نہ ہو جس کے حصول کو شریعت درست قرار نہیں دیتی، مثلاً علم نجوم وغیرہ یا دوسرے ایسے علم جو عقیدہ وعمل پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

اس حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ایسا عالم جس کی نیت حصول علم کے سلسلہ میں خالص اللہ کی رضا کے لیے نہ ہو اسے جنت کی خوشبو بھی میسر نہیں آئے گی، یہ اشارہ ہے بہشت میں عدم دخول سے اور مبالغہ ہے محرومی جنت سے، اور اس سے مراد یہ ہے کہ ایسا شخص مخلص اور مقرب بندوں کے ہمراہ بغیر عذاب کے جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

علم اپنی لطافت اور نورانیت کے سبب ریاکاری، خودنمائی، غرور وتکبر اور بے جا فخر کی غلاظتوں کو برداشت نہیں کرسکتا، جب علم کی اولین کرن یہی چاہتی ہے کہ وہ انسان کے دل ودماغ سے ظلم وجہل کی ہر تاریکی کو دور کردے تو یہ کیسے برداشت کیا جاسکتا ہے کہ ایک عالم جس کے دماغ میں علم کی روشنی بھری ہو وہ صرف اس علم سے دنیا کی متاع حاصل کرے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری نیتوں کو اپنی رضا کے لیے خالص کرلے اور اللہ تعالیٰ حاملین علم دین کو توفیق عطا فرمائے کہ ہمیشہ ان کے سامنے رسول

اللہ صلی اللہ علیہ سلم کے ارشادات وتنبیہات رہیں۔آمین!

## استغفار وتوبہ رزق کی کنجی

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص ،استغفار کو اپنے اوپر لازم کرلے تو اللہ اس کے لیے ہر تنگی سے نکلنے کا راستہ نکال دیتا ہے اور ہر غم و پریشانی سے اسے نجات دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے اور اس طرح رزق بہم پہنچاتا ہے جس کا اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔''

(ابوداؤد،ابن ماجہ ومسند احمد)

فائدہ:

استغفار کی اصل غرض و غایت اور اس کا موضوع تو اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کو معاف کرانا ہے تاکہ بندہ ان کے عذاب و وبال سے بچ جائے لیکن قرآن مجید سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بتلایا ہے کہ استغفار بہت سی دنیاوی برکات کا بھی باعث بنتا ہے اور بندے کو اس کے طفیل بہت کچھ ملتا ہے۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ استغفار بہت سی پریشانیوں اور مصیبتوں سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، کتنی ہی پریشانیاں آدمی کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں،استغفار کرنے سے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اس کی پریشانیاں بھی دور ہوجاتی ہیں۔استغفار کو اپنے اوپر لازم قرار کرلینے کا مطلب یہ ہے کہ جب گناہ سرزد ہوجائے یا کوئی آفت ومصیبت اور رنج وغم ظاہر ہو تو استغفار کرے،یا پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیشہ استغفار کا اہتمام کرے کیونکہ زندگی کا کوئی بھی لمحہ ایسا نہیں ہے جس میں انسان استغفار کا محتاج نہ ہو۔

بہت سے لوگوں کی توجہ کا مرکز رزق حاصل کرنے کا مسئلہ ہے بلکہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد کا یہ گمان ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیمات کی پابندی رزق میں کمی کا سبب ہے،اس سے زیادہ تعجب اور دکھ کی بات یہ ہے کہ کچھ بظاہر دین دار لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ معاشی خوش حالی اور آسودگی کے حصول کے لیے کسی حد تک اسلامی تعلیمات سے چشم پوشی کرنا ضروری ہے،یہ نادان لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں یا باخبر ہونے کے باوجود اس بات کو فراموش کر چکے ہیں کہ کائنات کے مالک وخالق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نازل کردہ دین میں جہاں اخروی معاملات میں رشد وہدایت کارفرما ہے،وہاں اس میں دنیاوی امور میں بھی انسانوں کی راہنمائی فرمائی گئی ہے،جس طرح اس دین کا مقصد آخرت میں انسانوں کو سرفراز وسربلند کرنا ہے،اسی طرح یہ دین اللہ تعالیٰ نے اس لیے بھی نازل فرمایا ہے کہ انسانیت اس دین سے وابستہ ہوکر دنیا میں بھی خوش بختی اور سعادت مندی کی زندگی بسر کرے۔

جن اسباب کی بناء پر بندے اللہ تعالیٰ سے رزق طلب کرتے ہیں ان میں سے ایک اہم سبب اللہ تعالیٰ کے حضور استغفار وتوبہ کرنا ہے۔بہت سے لوگوں کے خیال میں استغفار وتوبہ کا تعلق صرف زبان سے ہے،توبہ واستغفار کا دعویٰ کرنے والے کتنے ہی لوگ ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں۔﴿ استغفر الله و اتوب الیه۔﴾ یعنی میں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی کا سوال کرتا ہوں اور اپنی سیاہ کاریوں سے توبہ کرتا ہوں۔لیکن ان الفاظ کا اثر نہ ان کے دل پر ہوتا ہے اور نہ ان کے اثرات کا اظہار ان کے اعمال میں دکھائی دیتا ہے۔لہذا اس بات کا خاص دھیان رکھا جائے کہ استغفار وتوبہ صرف زبان تک ہی نہ رہے،دل کی ندامت اور اصلاح عمل کی کوشش کے بغیر زبانی استغفار وتوبہ جھوٹوں اور دغابازوں کی عادت ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے استغفار و توبہ کی کیا قدر و قیمت ہوسکتی ہے!

اے رزق کے متلاشیو! کثرت سے استغفار وتوبہ کرو،اپنے گناہوں سے دور ہوجاؤ،گزشتہ سیاہ کاریوں پر ندامت کے آنسو بہاؤ اور اس بات کا عزم کرلو کہ آئندہ ساری زندگی ان گناہوں کے قریب نہیں جاؤ گے،پھر بے شک اس حدیث پاک میں جو خوش خبری سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے استغفار وتوبہ کے متعلق دی ہے وہ ضرور اور لازم حاصل ہوگی۔کیونکہ اس خبر کی سچائی اور حقانیت میں کیا شبہ کیا جاسکتا ہے جس کی خبر دینے والے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں سب سے سچے ہیں اور پھر وہ ایسی خبر اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی سے دیتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو سرکار کے ان فرمان پر

صحیح یقین وعمل کی توفیق نصیب فرمائے۔آمین!

## عقیدہ توحید ہی دین کی اساس ہے

زید بن سلام سے روایت ہے کہ ان سے ابوسلام نے کہا کہ ان سے حارث اشعری نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''اللہ تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کو پانچ باتوں کے متعلق حکم دیا تھا کہ ان پر خود بھی عمل کریں اور بنی اسرائیل سے کہیں وہ بھی ان پر عمل کریں، یحییٰ علیہ السلام کو اس میں (یعنی بنی اسرائیل سے کہنے میں ) کچھ تاخیر ہونے لگی تو عیسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ نے آپ کو پانچ باتوں کے بارے میں حکم دیا تھا کہ آپ خود بھی ان پر عمل پیرا ہوں اور بنی اسرائیل سے بھی ان پر عمل کرنے کو کہہ دیں تو یا تو آپ ان سے کہہ دیجیے یا پھر میں ہی ان سے کہہ دوں، یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا(چونکہ مجھے حکم دیا گیا ہے اس لیے ) مجھے ڈر ہے کہ اس سلسلہ میں آپ نے مجھ سے سبقت کی تو کہیں میں زمین میں دھنسا نہ دیا جاؤں یا کسی عذاب میں گرفتار نہ ہوجاؤں، اس کے بعد انہوں نے لوگوں کو بیت المقدس میں جمع کیا ، جب وہ خوب بھر گیا اور لوگ گیلریوں تک میں بیٹھ گئے تو فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے پانچ باتوں کے متعلق حکم دیا ہے کہ خود بھی ان پر عمل کروں اور تمہیں بھی ان پر عمل کرنے کی تاکید کروں، پہلی بات یہ ہے کہ تم اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو کیونکہ جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص صرف اپنے سونے چاندی کے مال سے (بلاشرکت غیرے ) ایک غلام خریدے اور اسے بتادے کہ دیکھ یہ میرا گھر ہے اور یہ میرا کام ہے، تو کام کرنا اور اجرت مجھے دیتے رہنا، وہ کام تو کرے مگر اجرت اپنے آقا کے بجائے کسی اور شخص کو دے دے بھلا تم میں یہ کون پسند کرے گا کہ اس کا غلام ایسا ہو۔اور (دوسری بات یہ کہ ) اللہ تعالیٰ نے تمہیں نماز کا حکم دیا ہے، لہٰذا جب تک نماز میں رہو ادھر ادھر نہ دیکھو کیونکہ اللہ اپنے بندے کی طرف پوری طرح متوجہ رہتا ہے جب تک وہ ادھر ادھر نہیں دیکھتا۔اور (تیسری بات یہ کہ ) اس نے تمہیں روزے کا حکم دیا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی جماعت میں ایک شخص ہو جس کے پاس تھیلی ہو جس میں مشک ہو اور ہر شخص کو اس کی خوشبو اچھی معلوم ہوتی ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک روزہ دار (کے منہ ) کی بو مشک کی خوش بو سے زیادہ پیاری ہوتی ہے، اور (چوتھی بات ) اس نے تمہیں صدقے کا حکم دیا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کو دشمن نے قید کرلیا ہو اور اس کے ہاتھ اس کی گردن سے باندھ دیے ہوں اور اس کی گردن مارنے کے لیے اسے لے جارہے ہوں، وہ کہے کہ میں اپنی جان کے عوض تھوڑا اور بہت (جو کچھ میرے پاس ہے ) سب دے دیتا ہوں اور اس طرح فدیہ دے کر ان سے اپنی جان چھڑالے، اور (پانچویں بات ) اس نے تمہیں ذکر اللہ کا حکم دیا ہے کیونکہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص ہو جس کے تعاقب میں دشمن تیزی سے آرہا ہو، یہاں تک کہ یہ شخص (دوڑتے دوڑتے ) کسی مضبوط قلعے کے اندر آجائے اور (اس میں آکر ) اپنی جان کو دشمن سے بچالے، اسی طرح بندہ اللہ کے ذکر کے سوا کسی طرح بھی اپنے آپ کو شیطان سے نہیں بچا سکتا۔''
(ترمذی)

فائدہ:

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے ان پانچ باتوں کی بنی اسرائیل کو تلقین فرمائی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے خود ان کو عمل کرنے کا اور قوم نبی اسرائیل کو عمل کرنے کا حکم دیا ہے، ان تعلیمات میں سب سے پہلی اور بنیادی تعلیم ہی اس چیز کی دی گئی جس کی تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں نبوت و رسالت دے کر مبعوث فرمایا اور وہ ہے عقیدہ توحید یعنی کلمہ واحد کا دل وزبان، قول وعمل سے اقرار، اور عقیدہ توحید کا ذاتی، صفاتی اور عبادتی ہر معاملے میں اقرار۔توحید ذات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات میں اکیلا بے مثال اور لاشریک مانا جائے اس کا بیان قرآن مجید میں مختلف پیرائے میں کیا گیا ہے اور سورہ اخلاص میں اس کی مکمل طور پر تصویر کشی کی گئی ہے۔

﴿کہو وہ اللہ ایک ہے، وہ معبود برحق بے نیاز ہے، نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا، اور کوئی اس کا ہمسر نہیں﴾ (الاخلاص ۴۔۱)

توحید عبادت یہ ہے کہ ہر قسم کی عبادت کو صرف اللہ کے لیے خاص کیا جائے اور کسی دوسرے کو اس میں شریک نہ کیا جائے، قرآن مجید میں عبادت کا لفظ دو مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے، پہلا مفہوم اس اعتبار سے ہے کہ ہر طرح کی عبادت مثلاً نماز، سجدہ، نذر ونیاز، صدقہ، خیرات، قربانی

،طواف، دعا، فریاد، استعانت سب کی سب صرف اللہ ہی کے لیے ہوں، دوسرا مفہوم یہ ہے اطاعت وفرمانبرداری کے اعتبار سے وہ یہ کہ زندگی کے تمام معاملات میں اطاعت وفرمانبرداری صرف اللہ تعالیٰ کے حکم اور قانون کی کی جائے ،اللہ تعالیٰ کے حکم کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے حکم یا قانون کی پیروی کرنا خواہ اپنا نفس ہو یا آباء واجداد کا طریقہ سب ہی توحید عبادت میں کسی کو شریک کرنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿ کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا الٰہ بنالیا۔﴾ (فرقان ۴۳)

توحید صفات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان تمام صفات میں جو کہ قرآن واحادیث سے ثابت ہیں ، یکتا ، بے مثال اور لاشریک مانا جائے۔اللہ تعالیٰ کی صفات اس قدر بے حد وحساب ہیں کہ انسان کے لیے ان کا شمار کرنا تو کیا ان کا تصور کرنا بھی ناممکن ہے۔جیسا کہ خود رب العزت کا ارشاد ہے۔

﴿ زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر روشنائی بن جائے جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کے صفات ختم نہیں ہوں گے۔﴾ (لقمان ۲۷)۔توحید صفات ہی میں انسان اکثر وبیشتر دھوکا کھاتا ہے اور اس کو صحیح طور پر نہ سمجھنے سے شرک خفی کا شکار ہو جاتا ہے۔

عقیدہ توحید اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا عقیدہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور رسل کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا ہے اس عقیدہ کی تعلیمات روز اول سے ایک ہی ہیں ان میں کبھی کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں کی گئی، کتنے ہی انبیاء اور کتنی ہی قومیں آئیں لیکن تمام انبیاء کی بنیادی تعلیم یہی رہی۔

## نجات کا دارومدار کس پر ہے؟

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اس کی شہادت دے (یعنی زبان سے اقرار کرے اور دل سے سچ جانے ) کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں، اور اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم ) بلاشبہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں (اور اس بات کی شہادت دے کہ )عیسیٰ (علیہ السلام بھی ) اللہ کے بندے اور رسول اور اللہ کی بندی (مریم علیہ السلام ) کے بیٹے اور اس کا کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی جانب ڈالا تھا اور اللہ کی بھیجی ہوئی روح ہیں اور یہ کہ جنت ودوزخ حق (یعنی ان کا وجود واقعی ) ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں ضرور داخل کرے گا خواہ اس کے اعمال کیسے ہی ہوں۔''

(بخاری ومسلم )

فائدہ:

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ ابدی نجات کا دارومدار ایمان وعقائد کی اصلاح پر ہے،اس میں کسی قسم کی کوتاہی قابل معافی نہیں ہوسکتی، ہاں اعمال کی کمزوریاں حساب وکتاب کے مرحلے کے بعد اتنی سزا بھگتنے کے بعد یا پھر رحمت خداوندی سے معاف ہوسکتی ہیں۔

ایمان کی بنیاد چونکہ توحید کو ماننا اور اس کی شہادت دینا ہے اس لیے سب سے پہلے اسے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اللہ کی وحدانیت اور اس کی الوہیت و ربوبیت پر صدق دل سے اعتقاد رکھا جائے پھر اس کے بعد رسالت کا درجہ ہے تو ضروری ہے کہ رسول کی رسالت پر ایمان لایا جائے،اسی طرح تمام رسولوں کی رسالت پر ایمان رکھنا بھی نجات کے لیے ضروری ہے۔

یہاں صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر علامت کے طور پر بھی ہے اور ایک خاص وجہ سے بھی دراصل ان کے بارے میں ایک گروہ (یعنی عیسائیوں ) کا عقیدہ یہ ہے کہ عیسیٰ ابن اللہ ہیں،اس باطل عقیدہ کی تردید کے لیے ان کا ذکر کیا گیا اور وضاحت کردی گئی کہ عیسیٰ نہ تو اللہ کے بیٹے ہیں اور نہ اللہ کے اندر حلول کیے ہوئے ہے بلکہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں جسے اس نے اپنی ایک بندی مریم کے پیٹ سے پیدا کیا اسی لیے ان کو'' کلمتہ اللہ'' کہا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش بغیر باپ کے صرف اللہ کے حکم ''کن'' سے ہوئی،''روح اللہ'' ان کو اس لیے نہیں کہا گیا ہے کہ ان کے اندر اللہ کا کوئی جزو یا اللہ کی روح شامل ہے بلکہ'' روح اللہ'' آپ کا لقب اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ آپ اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کردیا کرتے تھے اور مٹی کی چڑیاں بنا کر اور ان میں جان ڈال کر اڑا دیا کرتے تھے۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔﴿مسیح ابن مریم تو صرف اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ (حکم) ہیں، جسے مریم کی طرف ڈال دیا تھا اور اس کے پاس کی روح ہیں اس لیے تم اللہ کو اور اس کے سب رسولوں کو مانو، اور نہ کہو کہ اللہ تین ہیں اس سے باز آ جاؤ کہ تمہارے لیے بہتری ہے، اللہ عبادت کے لائق تو صرف ایک ہی ہے اور وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی اولاد ہو، اسی کے لیے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ کافی ہے کام بنانے والا۔﴾ (النساء ۱۷۱)

قرآن پاک اور اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے کلمہ کن سے پیدا کیا، اور جس طرح وہ بغیر ماں باپ کے پیدا کیے گئے، اسی طرح عیسیٰ بھی کلمہ کن (حکم خداوندی) سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے، چنانچہ ایک جگہ قرآن میں اس طرح آتا ہے۔

﴿اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال ہو بہو آدم کی مثال ہے جسے مٹی سے پیدا کر کے کہہ دیا کہ ہو جا! پس وہ ہو گیا۔﴾ (آل عمران ۵۹)

عقیدہ توحید و رسالت کے بعد تصور آخرت کا عقیدہ بھی بنیادی ہے یعنی اس بات پر ایمان و یقین رکھنا کہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا برحق ہے اور جنت و دوزخ واقعی چیزیں ہیں، یہ وہ عقائد ہیں جن کو ماننا، صدق دل سے ان پر ایمان رکھنا اور خلوص نیت سے ان کو تسلیم کرنا ابدی نجات کا ضامن ہے، ان عقائد کو مانتے ہوئے اگر اعمال کی کوتاہیاں بھی ہوں تو اس صورت میں بھی اس حدیث مبارکہ میں جنت کی بشارت دی گئی ہے، لیکن جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے یہ بات طے ہے کہ جو عملی کوتاہیاں اور بد اعمالیاں سرزد ہوں گی ان پر سزا ملے گی مگر سزا پوری ہونے کے بعد اس کو بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا، لہٰذا اس حدیث کو اس مفہوم میں لینا چاہیے کہ اگر ان عقائد کے ماننے کے بعد کسی نے اعمال بھی اچھے کیے، شریعت کی پیروی کرتے ہوئے تمام احکام بجالایا اور خلاف شرع کوئی کام نہیں کیا تو بغیر کسی عذاب و سزا کے اسے جنت میں داخل کیا جائے گا اور اگر کسی نے ان عقائد کو ماننے کے بعد اعمال اچھے نہ کیے، شریعت کی پابندی نہیں کی، اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کی فرمانبرداری نہیں کی تو وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتے گا مگر آخر کار سے بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح ایمان و عقائد نصیب فرمائے اور اس کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی بداعمالیوں سے بھی محفوظ و مامون فرمائے۔ آمین!

## موسیقی

حضرت امامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مسلمانوں کے لیے ہدایت و رحمت بنا کر بھیجا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں بانسری، طنبورہ، صلیب اور امور جاہلیت کو مٹا دوں۔''

(ابوداؤد)

فائدہ:

آج ہمارے معاشرے میں گانے کا رواج بہت عام ہو چکا ہے، گھر گھر، گلی گلی، فلمی گانوں اور موسیقی کی آواز سے گونج رہے ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر، ڈش اور کیبل وغیرہ نے ان کو بام عروج پر پہنچا دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل سے اس کا گناہ ہونا نکل چکا ہے۔ بلکہ اس کو روح کی غذا بتایا جا رہا ہے۔ لیکن قرآن پاک میں اللہ رب العزت نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿بعض لوگ ایسے ہیں جو ان باتوں کے خریدار ہیں جو اللہ تعالیٰ سے غافل کرنے والی ہیں، تاکہ بے سوچے سمجھے اللہ کی راہ سے بھٹکائیں اور اس راہ حق کا مذاق اڑائیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے ذلت دینے والا عذاب ہے۔﴾ (لقمان-۶)

اس آیت میں لھو الحدیث (غافل کرنے والی بات) سے مراد گانا، بجانا اس کا ساز و سامان اور آلات ہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جب اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں اس سے مراد گانا ہی ہے۔'' آپ نے یہ جملہ تین بار دہرایا۔ اس آیت کے نزول کا واقعہ یہ ہے کہ نضر بن حارث جو اسلام کا سخت دشمن تھا اور چاہتا تھا کہ لوگ قرآن کی طرف متوجہ نہ ہوں اور اس سلسلے میں وہ مختلف کوششیں کرتا رہتا تھا جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس نے ایک گانے والی کنیز رکھی ہوئی تھی۔ وہ جس کو اسلام کی طرف

مائل دیکھتا اس کنیز کا گانا سنواتا اور پوچھتا بتاؤ، مزہ گانے میں ہے یا قرآن کریم میں؟ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ قرآن سے دور اور گانے بجانے میں لگ جائیں اور اللہ نے اس آیت کے ذریعے اس کو حرام قرار دے دیا۔

لیکن دین سے دور کرنے کا جو طریقہ نضر بن حارث نے دکھایا اس کے پیروکار آج بھی اس کو استعمال کر رہے ہیں، اس اعتبار سے اس میں گلوکار اور گلوکارائیں بھی آجاتی ہیں جو آج کل فن کار، فلمی ستارہ اور ثقافتی سفیر اور نا جانے کیسے کیسے مہذب، خوش نما اور دل فریب ناموں سے پکاری جاتی ہیں، آج کل میڈیا کے ذریعے عریاں فلم، فحش ڈرامے، ناچ گانے، چوری ڈکیتی اور قتل و غارت گاری کے پروگرام دکھا کر یہ مقصد خوب حاصل کیا جا رہا ہے۔ بلکہ قوم کی ساری خرابیوں کا واحد علاج عریانی فحاشی اور گانا بجانا بتایا جا رہا ہے۔ درحقیقت یہ ایسا نشہ ہے کہ جب کوئی قوم اس میں مست ہو جاتی ہے تو پھر سب کچھ بھول جاتی ہے۔ دین کا تو کیا کہنا اپنی دنیا سے بھی غافل ہو جاتی ہے۔

صفوان بن امیہ کہتے ہیں کہ ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ عمرو بن مرّہ حاضر خدمت ہوا اور یہ درخواست کی کہ حضرت میں تنگ دست ہوں میرے لیے ذریعہ معاش صرف دف بجانا ہی ہے۔ جناب مجھے اجازت فرما دیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے دشمن تم جھوٹ کہتے ہو، تجھے اللہ تعالیٰ نے حلال رزق دیا تو نے اسے حرام بنالیا۔ اگر تو نے اس برے کام سے توبہ نہ کی تو میں سر منڈوا کر تجھے مدینہ سے نکال دوں گا اور مدینہ کے نوجوانوں کو حکم دوں گا کہ وہ تیرا مال لوٹ لیں۔ یہ تو دنیا میں تیرا حشر ہوگا اور قیامت کے دن تو ننگا اور ہیجڑا بن کر اٹھے گا۔ تیری دماغی حالت اس انسان کی طرح ہوگی جس کا دماغی توازن مرگی نے ضائع کر دیا ہو۔ پھر جب وہ چلا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ نافرمان ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی بغیر توبہ کے مر گیا تو قیامت کے دن اسے اللہ تعالیٰ ہیجڑا اور ننگا اٹھائے گا اس کے بدن پر ذرا بھی کپڑا نہ ہوگا، جب کبھی کھڑا ہوگا بے ہوش ہو کر گر پڑے گا۔ (بحوالہ ابن ماجہ)

دف کی بنیاد پر موسیقی کو جائز قرار دینے والے اس روایت پر غور فرمائیں اور اپنی سوچ اور فکر کو ٹھیک کر لیں۔ موسیقی وغیرہ سے کچھ مسرت اور تسکین نفس کے پجاریوں کو حاصل ہو جاتی ہے مگر ایمان والوں کے دلوں کا اطمینان تو اللہ کے ذکر میں ہے۔

﴿جو لوگ ایمان لائے ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں، یاد رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو تسلی حاصل ہوتی ہے۔﴾ (الرعد ۲۸)

## سلام کا اسلامی طریقہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''چھوٹا بڑے کو سلام کیا کرے، اور راستہ سے گزرنے اور چلنے والا بیٹھے ہوؤں کو سلام کیا کرے اور تھوڑے آدمی زیادہ آدمیوں کی جماعت کو سلام کیا کریں۔''

(بخاری و مسلم)

فائدہ:

سلام ایک ایسی عظیم عبادت ہے جو جھگڑوں کو ختم کر دیتی ہے، کیونکہ اگر باہم دشمنیاں بھی ہوں، عداوتیں بھی ہوں اور دشمن آپ کو سلام کرے تو دشمنیاں ڈھیلی پڑ جائیں گی، کیونکہ آپ سلام کرنے والے کو وعلیکم السلام کہنے پر مجبور ہوں گے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے سلامتی ہو، جب سلامتی کی دعا کوئی دے گا تو جھگڑا کیوں کر رہے گا؟ اس لیے احادیث مبارکہ میں سلام کو پھیلانے کی نہایت تاکید فرمائی گئی ہے۔

ایک حدیث میں اس طرح آتا ہے کہ: تم جنت میں نہیں جا سکتے جب تک کہ پورے مومن نہ ہو جاؤ (یعنی تمہاری پوری زندگی ایمان والی نہ ہو جائے) اور یہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم میں آپس میں محبت نہ ہو جائے، کیا میں تمہیں وہ طریقہ نہ بتا دوں جس کے کرنے سے تمہارے درمیان پیار و محبت پیدا ہو جائے (وہ یہ ہے کہ)، سلام کو آپس میں خوب پھیلاؤ۔ (بحوالہ مسلم)

یہاں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آسان اور عملی تدبیر کا ذکر فرمایا ہے اور وہ یہ کہ اگر مومن اپنے معاشرے میں ایک دوسرے سے بے گانہ بن کر نہ رہیں بلکہ جب وہ آپس میں ملیں تو ایک دوسرے کو سلام کیا کریں اور ان کا یہ سلام محض رسمی بن کر نہ رہے بلکہ اس کے پیچھے صحیح جذبہ اور صحیح فکر و شعور کار

فرما ہو، وہ سلام کرکے دل سے اس بات کا اظہار کررہے ہوں کہ وہ دنیا اور آخرت میں ایک دوسرے کی سلامتی اور بھلائی اور کامیابی کی خواہش رکھتے ہیں، بے شک اس میں شبہ نہیں کہ سلام کے اسلامی طریقہ کو اگر سماج میں رواج دیا جائے تو لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے احترام و محبت کا جذبہ ابھرسکتا ہے۔

اس حدیث میں ایک دوسرے کو باہمی سلام کرنے کے بارے میں آداب کا ذکر ہے، چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ کم عمر والا بڑی عمر والے کو پہلے سلام کرے، اس سے بڑے کی عزت وتوقیر مقصود ہے اور آنے والے کو حکم ہے کہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے، اس کی حکمت وعلت یہ معلوم ہوتی ہے کہ آنے والے سے ضرر و نقصان کا اندیشہ ہوسکتا ہے مگر جب وہ پہلے سلام کرے گا تو گویا خطرہ کا اندیشہ ختم ہوگیا اور اسی طرح کم تعداد، زیادہ تعداد والوں کو سلام کیا کریں اس میں کثرت کو قلت پر فوقیت اور افضلیت کی طرف اشارہ ہے، گویا اسلام نے مرتبوں کا خیال رکھنے کا اہل اسلام کو سبق دیا ہے جس پر اس امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر حالت میں عمل پیرا ہونا چاہیے۔

اسی طرح ایک اور حدیث مبارکہ میں اس طرح آتا ہے جو شخص سواری پر ہو وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے، پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور تھوڑے آدمی زیادہ آدمیوں کی جماعت کو سلام کیا کریں۔(بحوالہ بخاری ومسلم)

اس حدیث میں پہلے کی حدیث میں بیان کردہ آداب کے ساتھ یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ سوار پیدل چلنے والوں کو سلام کیا کریں، اس ہدایت کی یہ حکمت ظاہر ہے کہ سوار کو بظاہر دنیاوی بلندی اور بڑائی حاصل ہے اور سواری پر بیٹھا انسان ذرا بڑائی کے زعم اور تکبر میں مبتلا ہوجایا کرتا ہے، اس لیے ازالہ کے لیے حکم فرمایا کہ سوار پہلے سلام کرکے اپنی بڑائی کی نفی اور اپنی تواضع اور محبت کا اظہار کرے۔

ایک اور حدیث میں اس طرح آتا ہے کہ سلام کرنے کی عادت عام کرو۔(بحوالہ ترمذی)

یعنی ایک دوسرے کو سلام کرو خواہ تعارف ہو یا نہ ہو۔لیکن آج کل ہمارے معاشرے کا یہ حال ہے کہ جب تک تیسرا آدمی تعارف نہ کرائے نہ بول، نہ چال نہ سلام نہ کلام، یہ متکبرانہ تمدن ہے یہ اسلام کا تمدن نہیں ہے، اسلام کا تمدن یہ ہے کہ جب ہم سب میں اسلام کا لازوال رشتہ مشترک ہے، اسلامی اخوت اور بھائی چارگی ہے تو کیا ضرورت ہے کہ کوئی تیسرا تعارف کرائے، خود سلام ہی ہمارا تعارف ہے، دو حقیقی بھائی اتنے قریب نہیں ہوتے جتنا دینی رشتے کی وجہ سے دو مسلمان قریب ہوتے ہیں، یہاں ایک اور بات بھی قابل غور ہے کہ اکثر تعارف کرانے میں یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی امیر آدمی ہے تو اس کا تعارف کرادیا جاتا ہے لیکن اگر کوئی غریب آدمی آئے تو اس کا تعارف نہیں کرایا جاتا، گویا آپ کا سلام بڑے آدمی کو تو ہوگا لیکن چھوٹے کو نہیں، یہ خود ایک تکبر ہے کہ چھوٹوں کو منھ نہ لگایا جائے اور بڑوں کے سامنے جھکا جائے، سلام کے آداب میں یہ بھی ہے کہ جب دو آدمی آپس میں ملیں تو یہ انتظار نہ کریں کہ دوسرا مجھے سلام کرے، کوشش کریں میں پہلے سلام کروں یہ زیادہ افضل ہے نہ کہ انتظار کرے۔اللہ تعالی ہم سب کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر یقین وعمل کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

## آیت الکرسی قرآن کریم کی عظیم ترین آیت

حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ تعالی عنہ کہتے ہیں کہ(ایک مرتبہ مجھ سے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:’’ابو المنذ ر(یہ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ تعالی عنہ کی کنیت ہے) کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے نزدیک کتاب اللہ کی کون سی آیت سب سے عظیم ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی سب سے زیادہ جاننے والے ہیں(کہ وہ کون سی آیت ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (پھر) پوچھا کہ ابو المنذ ر! کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے نزدیک کتاب اللہ کی کون سی آیت سب سے عظیم ہے؟ میں نے عرض کیا کہ’’ اللہ لاالہ الا ھو الحی القیوم‘‘(یعنی پوری آیت الکرسی)۔حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ تعالی عنہ کہتے ہیں کہ(یہ سن کر) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا (گویا اس جواب پر شاباشی دی) اور فرمایا کہ ابو المنذ ر تجھے علم مبارک ہو(یعنی اس علم کی برکت سے تجھے قرآن کی عظیم ترین آیت کا پتہ چل گیا)۔‘‘

(مسلم)

فائدہ:

آیت الکرسی کی بے انتہا فضیلت صحیح احادیث سے ثابت ہے،جیسا کہ اس حدیث میں بھی اس کو قرآن کریم کی سب سے عظیم ترین آیت قرار دیا گیا ہے،اس کے پڑھنے سے رات کو شیطان سے تحفظ رہتا ہے، ہر فرض نماز کے بعد اس کو پڑھنے کی بڑی فضیلت ہے وغیرہ وغیرہ ، چونکہ اس آیت شریف میں کرسی کا ذکر موجود ہے اس لیے عوام وخواص سب ہی اسے آیۃ الکرسی کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں،خود روایات حدیث میں اسے آیۃ الکرسی کے نام سے ذکر فرمایا گیا ہے۔ یہ آیت سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۵ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات جلال،اس کی علو شان اور اس کی قدرت وعظمت پر مبنی نہایت جامع آیت ہے۔اس آیت میں اللہ جل شانہ کی توحید ذات وصفات کا بیان ایک عجیب وغریب انداز میں بیان کیا گیا ہے جس میں اللہ جل شانہ کا موجود ہونا،زندہ ہونا،سمیع و بصیر ہونا،متکلم ہونا،واجب الوجود ہونا،دائم و باقی ہونا،تمام کائنات کا موجد و خالق ہونا،تغیرات و تاثرات سے بالاتر ہونا،صاحب عظمت وجلال ہونا کہ اس کے آگے کوئی بغیر اس کی اجازت کے بول نہیں سکتا،ایسی قدرت کاملہ کا مالک ہونا کہ سارے عالم اور اس کی کائنات کو پیدا کرنے ،باقی رکھنے اور ان کا نظام محکم قائم رکھنے سے اس کو نہ کوئی تھکان پیش آتی ہے نہ سستی،ایسے علم محیط کا مالک ہونا جس سے کوئی کھلی یا چھپی چیز کا کوئی ذرہ یا قطرہ باہر نہ رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال پر جو جواب حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیا وہ صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین کا ایک عام طریقہ تھا،وہاں تو خاص طور پر یہ وجہ تھی کہ ممکن ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سابقہ معلومات سے الگ کوئی نیا آسمانی حکم بیان فرمانا چاہتے ہوں چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین عام اور معمولی باتوں کے سوال پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی جواب دیتے تھے،لیکن اس کے علاوہ عام حالات میں بھی کسی بڑے صاحب علم کے سامنے اپنی معلومات کا مظاہرہ کرنا کچھ تہذیب کے خلاف ہی ہوتا ہے،اس کے سامنے اپنی کم علمی کا اظہار اس کے خزانہ معلومات سے استفادے کا دروازہ کھولتا ہے۔

لیکن جب دوسری مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی سوال کیا تو حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سمجھے کہ میری معلومات کا جاننا اور میری رائے کا اندازہ کرنا ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد ہے تو انہوں نے جواب دیا گویا اس طرح انہوں نے بڑے لطیف انداز میں ادب اور فرمانبرداری دونوں کو جمع کردیا، جو کہ اہل کمال کا طریقہ ہے۔

شاباشی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے دی کہ یہ بات حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود اپنے غور وفکر اور اپنے اندازے کے مطابق کہی تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک کے معنی ومفہوم پر ان کی نظر بہت گہری تھی اور انہوں نے اس آیت کے مضمون سے ہی اس کی عظمت واہمیت کا اندازہ لگالیا جو بالکل درست تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا کہ علم مبارک ہو،کا مطلب یہ ہے کہ علم تیرے لیے نافع اور عزت وسرفرازی کا باعث ہو،اس علم سے مراد قرآن وحدیث کا علم ہے جو یقیناً دنیا وآخرت میں سرخروئی کا باعث ہے۔

## ایثار

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک چادر (ہدیہ وتحفہ کے طور پر) لے کر آئی ،اور عرض کیا کہ: حضرت! میں یہ چادر آپ کو اڑھانا چاہتی ہوں،آپ نے وہ چادر قبول فرما کر اوڑھ لی،اور آپ کی حالت یہ تھی کہ اس وقت آپ کو اس کی ضرورت تھی،آپ کے صحابہ میں سے ایک صاحب نے آپ کو وہ چادر اوڑھے دیکھا تو عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ چادر تو بہت ہی اچھی ہے، یہ تو مجھے عنایت فرمادیجیے،آپ نے فرمایا: بہت اچھا (اور وہ چادر اسی وقت اتار کر ان صاحب کو دے دی) پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مجلس سے اٹھ گئے تو بعض ساتھیوں نے ان صاحب کو ملامت کی اور کہا تم نے یہ اچھا نہیں کیا،تم نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اس کی ضرورت تھی اور آپ نے حاجت مندی کی حالت میں یہ چادر اس خاتون سے قبول کی تھی،اس کے باوجود تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو مانگ لیا،حالانکہ تم جانتے ہو کہ آپ کی عادت کریمہ یہ ہے کہ جو چیز بھی آپ سے مانگی جائے ،آپ اس کو دے ہی دیتے ہیں،ان صاحب نے عرض کیا،میں نے تو برکت

کے خیال سے ایسا کیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پہن لیا تھا،اب مجھے امید ہے کہ یہی مبارک چادر میرا کفن بنے گی،حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ وہ چادر اس کا کفن ہی ہوئی۔''

(بخاری)

فائدہ:

مسلمان کے اخلاق میں اور جو اس نے دینی تعلیمات اور اسلام کی اچھائیوں سے فیوض و برکات کمائے ہیں،ان میں ایثار اور دوسروں سے محبت کرنا بھی شامل ہے،جبھی وہ مقام ایثار پاتا ہے تو اپنے پر دوسرے کو فوقیت دیتا ہے،خود بھوکا رہتا ہے،مگر دوسرے کو پیٹ بھر کر کھلاتا ہے،خود پیاسا ہے،مگر ساتھی کی پیاس بجھاتا ہے، بلکہ وہ تو دوسروں کی زندگی کے لیے مر بھی جاتا ہے اور یہ کسی فرد کے لیے کوئی عجیب وغریب بات نہیں جو کمال کی صفات سے بہرہ ور اور اچھائی اور فضل و جمال کی محبت سے سرشار ہو۔

اس حدیث مبارکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایثار کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے،ایثار حقیقت میں احسان و اخلاق کا ایک اعلیٰ درجہ ہے،ایثار یہ ہے کہ آدمی اپنی ضرورت کو نظر انداز کر کے دوسرے کی ضرورت پوری کردے،حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خود اپنا طرز عمل بھی ایثار کا تھا اور آپ دوسروں کو بھی اسی کی ترغیب و تعلیم فرماتے تھے،آپ کی تعلیم و تربیت کا یہ اثر تھا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین کی زندگی ہمیں قربانی و ایثار کے واقعات سے بھری ملے گی۔

قرآن کریم نے اپنے ماننے والوں کو ایثار کی تلقین اس طرح فرمائی ہے،ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿اور آپس میں حق سے بڑھ کر دینا نہ بھولو،یقیناً اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔﴾ (البقرہ ۲۳۷)

مسلمان کے جملہ اخلاق فاضلہ اور تمام صفات حسنہ قابل تعریف حکمت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے چشمہ صافی سے ماخوذ ہیں یا رحمت الٰہی کے فیضان سے ماخوذ ہیں۔جیسا کہ ایک موقع پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔(بحوالہ مسلم)

اس ہدایت پر عمل کرنے سے مسلمان کی عادات میں رفعت وعظمت اور بلندی حاصل ہوتی ہے۔

مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ ہجرت کے بعد انصار نے جو ایثار و قربانی دی ان انصاروں کی ایثار و قربانی کی مدح میں قرآن کریم میں یہ الفاظ آئے ہیں۔﴿اور وہ اپنی ذات پر ان (اپنے مہاجر بھائیوں) کو ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ اپنی جگہ محتاج ہوں،اور جو نفس کی کنجوسی سے بچالیا گیا وہی کامیاب (اور بامراد) ہے۔﴾ (الحشر ۹)

اس آیت کا ماننے والا اپنے نفس،اہل اور اولاد پر دوسرے مستحق لوگوں کو فوقیت دے گا اور اس ایثار میں وہ بڑھتا ہی رہے گا۔

ان انصاریوں میں سے ایک انصار کے ایثار کی یہ بھی ایک نہایت عجیب مثال ہے کہ اس کے پاس دو بیویاں تھیں تو اس نے ایک بیوی کو اس لیے طلاق دینے کی پیشکش کی کہ عدت گزر جانے کے بعد اس سے اس کا دوسرا مہاجر بھائی نکاح کرلے۔(بحوالہ بخاری)

## مال و دولت کا فتنہ

حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''بخدا میں تمہارے لیے فقر و افلاس سے نہیں ڈرتا بلکہ مجھے تمہارے بارے میں اس بات کا خوف ہے کہ دنیا تم پر کشادہ کردی جائے گی (اور تم مالداروں کا طور طریقہ اختیار کر کے مختلف قسم کی آفتوں اور بلاؤں کے ذریعہ ہلاکت و تباہی میں مبتلا ہوجاؤ گے) جس طرح سے ان لوگوں پر کشادہ کی گئی جو تم سے پہلے گزرے ہیں (اور وہ مال و دولت کی بے حد رغبت و محبت رکھنے کی وجہ سے فقراء اور مساکین پر رحم نہیں کھاتے تھے اور ان کی مدد و اعانت سے گریز کرتے تھے،جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو تباہ و برباد کردیا گیا) چنانچہ تم بھی دنیا کی طرف رغبت کرو گے (یعنی دنیا کو اختیار کرو گے اور اس کی طرف نہایت رغبت رکھو گے کہ ایک دوسرے سے مال و دولت

اور جاہ وحکومت حاصل کرنے کے لیے لڑائی جھگڑا شروع کردو گے) جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں نے اس کی طرف رغبت کی تھی اور پھر یہ دنیا تم کو اسی طرح برباد کردے گی جس طرح ان کو تباہ و برباد کرچکی ہے۔''

(بخاری ومسلم)

فائدہ:

اس حدیث مبارکہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی ایک انتہائی اہم اور نازک معاملے کی طرف راہنمائی فرمائی جو کہ آج کے حالات میں حرف بحرف صحیح ثابت ہورہی ہے، اگرچہ فقر و افلاس کی وجہ سے آدمی فتنہ و آزمائش میں پڑسکتا ہے لیکن اس سے بڑھ کر اس کے بارے میں اندیشہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کے لیے مال و متاع کی راہیں کھل جائیں اور وہ دولت کی چاہت میں اپنی اصل ذمہ داریوں کو فراموش کر بیٹھے، اسے صرف فکر ہو تو اس بات کی کہ کتنی جلد وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ سرمایہ سمیٹ لے، وہ حرص کا ایسا بندہ بن کر رہ جائے کہ نہ اسے فقراء و مساکین پر رحم آئے اور نہ اپنی دولت کو راہ خدا میں خرچ کرسکے اور بالآخر اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار ہو کر رہے، جس طرح پچھلی قومیں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بعض پچھلی قوموں اور امتوں کا یہ تجربہ تھا کہ جب ان کے پاس دنیا کی دولت بہت زیادہ آئی، تو ان میں دنیاوی حرص اور دولت کی رغبت و چاہت اور زیادہ بڑھ گئی اور وہ دنیا ہی کے دیوانے اور متوالے ہوگئے اور اصل مقصد زندگی کو بھلا دیا، پھر اس کی وجہ سے ان میں باہم حسد و بغض بھی پیدا ہوا اور بالآخر ان کی اس دنیا پرستی نے ان کو تباہ و برباد کردی، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے بارے میں اسی کا زیادہ ڈر تھا، اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے از راہ شفقت امت کو اس خطرے سے آگاہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ تم پر فقر و ناداری کے حملے کا مجھے زیادہ ڈر نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس تم میں بہت زیادہ دولت آجانے سے دنیا پرستی میں مبتلا ہو کر تمہارے ہلاک و برباد ہوجانے کا مجھے زیادہ خوف اور ڈر ہے۔

مال و دولت کی وہ فراخی و آسودگی جو دنیا کا گرویدہ بناتی ہے، حرص و طمع میں مبتلا کرتی ہے، جوڑنے سمیٹنے اور ذخیرہ اندوزی کا خوگر کرتی ہے، اور آخر کار یہ چیزیں انسان کو اخلاقی و روحانی طور پر تباہ و برباد کردیتی ہیں اور اخروی ہلاکت کا بھی ذمہ دار بنادیتی ہیں، اس لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دنیاوی خوشحالی و آسودگی اور مالداری سے اپنے خوف کا اظہار فرمایا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مقصد و مدعا اس خوشنما فتنہ کی خطرناکی سے امت کو خبردار کرنا ہے تاکہ ایسا وقت آنے پر اس کے برے اثرات سے اپنا بچاؤ کرنے کی فکر کی جائے۔

اللہ تعالیٰ تمام امت کو ان تمام فتنوں سے محفوظ فرمائے جو مسلمانوں میں آپس میں نفاق اور دشمنی کا باعث بنتے ہیں۔ آمین!

## بدعہدی اور اس کے نتائج

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''ہر ایک غدار کے لیے (قیامت کے روز) ایک جھنڈا ہوگا جو اس کی عہد شکنی و بدعہدی کا نشان ہوگا۔''

(بخاری)

فائدہ:

عربوں میں رواج تھا کہ وہ بدعہدی کرنے والوں کے لیے بازاروں میں جھنڈے گاڑ دیا کرتے تھے تاکہ وہ بدنام اور ذلیل ہوں، اسی رواج کو مدنظر رکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اخروی سزا کا تذکرہ فرمایا تاکہ اس جرم اور اس کی سزا کی نوعیت کو لوگ سمجھ سکیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ ﴿اے ایمان والو! عہد و پیماں پورے کرو۔﴾ (المائدہ۔۱)

ایک اور جگہ اس طرح فرمان الٰہی ہے۔ ﴿عہد کو پورا کرو، اس لیے کہ عہد کی بابت پوچھا جائے گا۔﴾ (بنی اسرائیل۔۳۵)

ایک عہد تو وہ ہے جو انسان آپس میں کرتے ہیں اور ایک عہد وہ ہے جو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان ہے، دونوں قسم کے عہدوں کی پاسداری

ضروری ہے اور ان میں کوتاہی پر قیامت والے دن پوچھ ہوگی۔

پاکستان کا قیام بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک عہد و پیماں ہے اور وہ ہے مملکت پاکستان میں نفاذ اسلام کا عہد تحریک پاکستان کے وقت ہر ایک کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا، پاکستان کا مطلب کیا؟ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه.

پاکستان کے لیے تمام مسلمانوں نے مشترکہ جدوجہد اس لیے کی تھی کہ ایک ایسی مملکت کا قیام ہو، جہاں قرآنی نظام زندگی ہو، عادلانہ اور اسلامی فلاحی معاشرہ ہو اور عقیدہ توحید سے وجود میں آنے والی تہذیب وثقافت فروغ پائے اور اسلام و اسلامی نظام حیات اپنے مکمل اوصاف کے ساتھ عالمی سطح پر متعارف ہو جائے، جہاں ہر سو اسلامی قوانین کی عمل داری ہو، جہاں جان کی امان ہو، جہاں جھوٹ، فریب، ریاکاری و دغابازی نہ ہو، حق دار کو وقت پر حق ادا ہو، جہاں منصف سچ اور جھوٹ کا فیصلہ بے خوف وخطر کریں، معاشرہ سود کی لعنت سے پاک ہو، جہاں شراب، حرام خوری و بدکاری کا نشان تک نہ ہو، جہاں فرقہ واریت، لسانیت وعصبیت نہ ہو۔

اب اس پر غور کرنا چاہیے کہ ہم نے اس اسلامی ریاست پاکستان کے ساتھ کیا سلوک کیا، آج پچپن (۵۵) سال گزرنے کے بعد بھی نفاذ اسلام کا عہد پورا نہیں کیا جاسکا ہے، ہم نے تو اس پاکستان کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر کے مسلمانوں کی تقسیم در تقسیم کا نمونہ پیش کر دیا، ہم نے نیا پاکستان بنایا اور پھر اس نئے پاکستان کے مزید حصے اور ٹکڑے کرنے کی ٹھانی ہے۔

اقوام عالم میں پاکستان کی موجودہ معاشرتی، ابتر سیاسی و معاشی صورتحال اور اخلاقی تاریکی کی شدت کا انکار، حقیقت سے انکار کے مترادف ہوگا۔ غور کریں وہ کیا بات ہے جو اس بگاڑ کا بنیادی سبب ہے، بگاڑ کا بنیادی سبب اللہ تعالیٰ سے بے وفائی اور اس عہد کی وعدہ خلافی ہے جو تحریک پاکستان کے دوران اللہ اور اس کی مخلوق سے کیا گیا، ہمارے دستور میں صرف اسلام کی بالادستی کو تسلیم کیا گیا، لیکن عملاً زندگی کے کسی بھی میدان میں شریعت کی بالاستی کو قائم نہیں کیا گیا، اور نہ ہی ایسی کسی جماعت یا لیڈر کو کام کرنے دیا گیا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا وفادار اور ان کے احکام کے مطابق زندگی کے ہر شعبہ کی تشکیل جدید کرنے کا اخلاص، جذبہ اور صلاحیت رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ اخلاص اور ایمان کی حامل قوتوں کی مدد فرماتا ہے یا اپنی مشیت کے مطابق کفر اور بغاوت کرنے والوں کو بھی کام کا موقع دیتا ہے، لیکن نفاق اور دوغلے پن کے ذریعے کبھی کسی بازی کو سر نہیں کیا جاسکتا، ہمارا اصل مسئلہ یہی ہے کہ ہم نے نام تو اسلام کا لیا لیکن عملاً اسلام سے انحراف کے ہر راستہ کو اختیار کیا، اللہ تعالیٰ کو تو ہم کیا دھوکہ دیتے بس اپنے آپ ہی کو دھوکہ دیا اور قوم کو ایک کے بعد دوسری مصیبت میں گرفتار کیا۔ آزادی کے پچپن سال کے بعد بھی پاکستان کا مسلمان انگریزی قوانین کے مطابق زندگی گزار رہا ہے، پہلے گورا انگریز مظالم ڈھاتا تھا اب کالے انگریز نے اس کی جگہ لے لی ہے۔

ہمارے لیے ترقی کا ایک ہی راستہ ہے کہ من حیث القوم ہم اللہ تعالیٰ سے اپنی اس روش پر توبہ کریں اور ایسی قیادت کو برسراقتدار لانے کی کوشش کریں جو اسلام کے بارے میں مخلص ہو اور یہ صلاحیت بھی رکھتی ہو کہ کسی سمجھوتے کے بغیر حکمت کے ساتھ اسلام کے اصول و مقاصد کے مطابق زندگی کے تمام شعبوں کی تشکیل نو کر سکے۔ کیونکہ فرمان الٰہی ہے۔

﴿اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کرلے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہوسکتا ہے۔﴾ (الرعد۔۱۱)

## جھوٹ کا دنیا اور آخرت میں نقصان

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب کوئی بندہ جھوٹ بولتا ہے تو (حفاظت کرنے والا) فرشتہ اس کے کلمہ (بات) کی بدبو کی وجہ سے ایک میل دور چلا جاتا ہے۔''

(ترمذی)

فائدہ:

اس حدیث سے جھوٹ کی سخت مذمت معلوم ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ فرشتوں کو جھوٹ سے بہت زیادہ نفرت ہے اور ان کو جھوٹ سے ایسی گھن آتی ہے کہ جوں ہی کسی کے منہ سے جھوٹ نکلتا ہے فرشتہ وہاں سے چل دیتا ہے اور ایک میل دور تک چلا جاتا ہے، واضح رہے کہ اس سے اعمال لکھنے والے فرشتوں کے علاوہ دوسرے فرشتے مراد ہیں جیسے حفاظت کرنے والے فرشتے وغیرہ، ناگواری اور نفرت تو سبھی فرشتوں کو ہوتی ہے لیکن جو فرشتے اعمال لکھنے پر مامور ہیں وہ مجبوراً ناگواری کو برداشت کرتے ہیں، اللہ کی پیاری مخلوق کو تکلیف پہنچانا کتنا برا عمل ہے اس کو خود سمجھ لیں اور اوپر سے جو جھوٹ کا گناہ ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

مادی چیزوں کی خوشبو اور بدبو کی طرح انسان کے اعمال وکلمات کی بھی اپنی خوشبو یا بدبو ہوتی ہے، مادیت کے غلبہ کی وجہ سے ہم سڑی گلی چیزوں کی بدبو تو محسوس کرتے ہیں لیکن ان چیزوں کی بدبو محسوس نہیں کرتے جن کی بدبو اس بدبو کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔

اسی طرح پھولوں کی خوشبو کا تو ہمیں پتہ چل جاتا ہے لیکن اس خوشبو اور لذت کو ہم محسوس کرنے سے قاصر رہتے ہیں جس کے مقابلہ میں عام خوشبوئیں اور لذتیں ہیچ ہیں، عام رنگ و بو کی رعنائیاں تو ہمارا دامن دل کھینچتی ہیں لیکن حقیقت اور روح کی رعنائیوں سے ہم بے خبر رہ کر ہی اس دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔

فرشتوں کی حس بہت لطیف اور تیز ہوتی ہے اس لیے وہ ہمارے اچھے برے اعمال تک کی خوشبو یا بدبو محسوس کرتے ہیں اور جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے دور ہٹ جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی باعزت مخلوق ہماری کذب بیانی کی بدبو کی وجہ سے ہم سے دور بھاگے، یہ ہمارے لیے کتنی شرم کی بات ہے لیکن ہمیں اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے جو اللہ کے مقرب اور نورانی مخلوق ہیں انہیں ہماری برائیوں سے تکلیف ہوتی ہے اور ہمارے قریب ہونے کے بجائے ہم سے دور بھاگتے ہیں، یہاں یہ بات پیش نظر رکھنے کی ہے کہ صرف جھوٹ ہی سے نہیں بلکہ غیبت اور بدزبانی وغیرہ کی بدبو سے بھی یہ پاکیزہ مخلوق ہم سے دور بھاگتی ہے، فرشتوں کے علاوہ انسانوں میں بھی جس شخص کی روحانیت اس کی مادیت پر غالب ہوتی ہے اسے اعمال کی خوشبو یا بدبو کا ادراک ہوسکتا ہے۔

انسان جسم ہی نہیں روح بھی رکھتا ہے بلکہ اصلاً وہ روح ہی ہے جو مادیت سے یکسر پاک ہے، اس لیے مادیت ہی کو سب کچھ سمجھ لینا کم نگاہی کے سوا کچھ اور نہیں ہے، جس طرح سے نفع ونقصان، راحت وتکلیف، لذت وناخوشگواری، نور وظلمت، پستی وبلندی، اور حسن وقبح کا احساس غیر مادی دنیا میں بھی ہوتا ہے، جو حسن وخوبی ہم کو مادی چیزوں میں نظر آتی ہے اس کا اس حسن اور خوبصورتی سے کوئی نسبت نہیں جو ان چیزوں میں پائی جاتی ہے جو مادیت سے پاک ہیں، سڑی چیزوں کی بدبو سے ہم پریشان ہوجاتے ہیں، لیکن یہ بدبو اس بدبو کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو اس چیز سے روح کو پہنچتی ہے جو روح کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہے، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مادی لذتوں سے زیادہ ایمانی وروحانی اور حقیقی نعمتوں اور لذتوں سے آشنا ہوں اور دنیا وآخرت میں اپنے آپ کو محرومی سے بچاسکیں۔

پس مومن بندوں پر لازم ہے کہ ہمیشہ سچ بولیں اور سچ ہی کو اختیار کریں، بچوں کو بھی سچ سکھلائیں اور سچ کی عادت ڈالیں ان کے بہلانے کے لیے بھی جو وعدہ کریں وہ وعدہ بھی سچا ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس حدیث سے یہ بات بخوبی معلوم ہوجاتی ہے کہ جھوٹ بولنے کا دنیا میں یہ نقصان ہے کہ اس کی حفاظت میں معمور فرشتے اس سے دور بھاگتے ہیں اور آخرت کی ہلاکت اور اس کی سزا اس کے علاوہ ہے۔

## غسل جنابت کا طریقہ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غسل جنابت فرماتے تھے تو سب سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دھوتے تھے، پھر بائیں ہاتھ سے مقام استنجاء کو دھوتے اور داہنے ہاتھ سے اس پر پانی ڈالتے تھے، پھر وضو فرماتے تھے، اسی طرح جس طرح نماز کے لیے وضو فرمایا کرتے تھے، پھر پانی لیتے تھے اور بالوں کی جڑوں میں انگلیاں ڈال کر وہاں پانی پہنچاتے تھے، یہاں تک کہ جب آپ سمجھتے تھے کہ آپ نے سب میں پوری طرح پانی پہنچالیا، تو دونوں ہاتھ بھر بھر کر تین دفعہ پانی اپنے سر کے اوپر ڈالتے تھے، اس کے بعد باقی سارے جسم پر پانی بہاتے

تھے،اس کے بعد دونوں پاؤں دھوتے تھے۔‘‘

(بخاری ومسلم)

فائدہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اپنے قول وعمل سے امت کومختلف احکامات،اس کے طریقے اورآداب سکھائے اور بتلائے ہیں،اسی طرح غسل کا طریقہ اوراس کے آداب بھی تعلیم فرمائے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اپنا محبوب قرار دیا ہے جو طہارت اور پاکیزگی کا پورا پورا اہتمام کرتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔طہارت اور پاکیزگی آدھا ایمان ہے۔(مسلم)

یعنی آدھا ایمان تو یہ ہے کہ آدمی روح کو پاک وصاف رکھے اور آدھا ایمان یہ ہے کہ جسم کی صفائی اور پاکی کا خیال رکھے،روح کی طہارت ونظافت یہ ہے کہ اس کو کفر وشرک اور بدعات،معصیت وضلالت کی نجاستوں سے پاک کرکے صالح عقائد اور پاکیزہ اخلاق سے آراستہ کیا جائے اور جسم کی طہارت ونظافت یہ ہے کہ اس کو ظاہری ناپاکیوں سے پاک وصاف رکھ کر نظافت اور سلیقے کے آداب سے آراستہ کیا جائے۔

غسل کی مشروعیت قرآن پاک سے ثابت ہے،ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿اور اگر تم جنبی ہوجاؤ تو نہاؤ۔﴾(المائدہ۔۵)

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے اور دوسرے فرمان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو بڑی تفصیل کے ساتھ غسل کا طریقہ بتایا ان احادیث کی روشنی میں ہمیں غسل کا مکمل طریقہ معلوم ہوجاتا ہے جو اس طرح ہے کہ’’ بسم اللہ ‘‘ کہہ کر غسل شروع کرے اور اس نیت سے کہ وہ حدث اکبر(جنابت) زائل کررہا ہے،اپنی دونوں ہتھیلیاں تین بار دھوئے،پھر استنجاء کرے اور شرم گاہ سے ہر طرح کی آلائش صاف کرے،پھر وضو کرے جس طرح نماز کے لیے وضو کیا جاتا ہے،البتہ پاؤں وضو کے ساتھ دھونا بھی جائز ہے اور غسل کے آخر میں دھوئے تو بھی جائز ہے،پھر دونوں ہتھیلیاں پانی سے تر کرے اور سر کے بالوں کی جڑوں میں ان کو داخل کرے اور سر کو کانوں سمیت تین بار دھوئے،پھر جسم کے دائیں پہلو پر پانی بہائے اور اوپر سے نیچے تک دھوئے،پھر اسی طرح بایاں پہلو دھوئے،نیز ناف کے اندر،بغلوں کے نیچے،گھٹنوں کے نیچے اہتمام کے ساتھ پانی بہائے۔

ایک روایت میں اس طرح آتا ہے کہ۔

ہر بال کے نیچے(جڑ) میں جنابت ہوتی ہے،لہذا بالوں کو(خوب) دھویا کرو اور بدن کو پاک کیا کرو۔(بحوالہ ابوداؤد،ترمذی وابن ماجہ)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ جنابت کا اثر انسان کے جسم کے ہر ہر حصے پر ہوتا ہے،اس لیے جنابت میں سر کے بالوں کو اچھی طرح دھویا جائے تاکہ پانی بالوں کی جڑ میں پہنچ جائے اس لیے اگر پانی بالوں کی جڑ تک نہیں پہنچے گا تو پاکی حاصل نہیں ہوگی،چنانچہ علماء نے کہا ہے کہ اگر ایک بال کے نیچے بھی جگہ خشک رہ جائے گی تو غسل ادا نہ ہوگا،بالوں کے ساتھ ساتھ بدن کو بھی اچھی طرح دھونے کا حکم دیا جارہا ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ نہانے کے وقت بدن کو خوب اچھی طرح مل کر میل وغیرہ صاف کرنا چاہیے اور پورے بدن پر پانی اس طرح بہانا چاہیے کہ بدن کا کوئی حصہ بھی خشک نہ رہ جائے۔

## عقیدہ آخرت اور عالم برزخ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:’’تم میں سے جب کوئی مرجاتا ہے تو ہر صبح وشام اس کے سامنے اس کا ٹھکانہ پیش کیا جاتا ہے،اگر وہ جنتیوں میں سے ہے،تو جنتیوں کے مقام میں سے(اس کا جو مقام ہونے والا ہوتا ہے وہ ہر صبح وشام اس کے سامنے کیا جاتا ہے،اور اس کو دکھلایا جاتا ہے) اور اگر وہ مرنے والا دوزخیوں میں سے ہوتا ہے،تو(اسی طرح صبح وشام) دوزخیوں کے مقامات میں سے(اس کا مقام اس کے سامنے کیا جاتا ہے) اور کہا جاتا ہے کہ یہ تیرا مستقل ٹھکانہ ہونے والا ہے(اور یہ اس وقت ہوگا) جب کہ اللہ تجھے اپنی

طرف اٹھائے گا قیامت کے دن۔''

(بخاری و مسلم)

فائدہ:

قرآن مجید نے عقیدہ آخرت کے مضمون کو اپنے بلیغ معجزانہ انداز اور نہایت مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

﴿کیا تم یہ گمان کیے ہوئے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بے کار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے ہی نہ جاؤ گے۔اللہ تعالیٰ سچا بادشاہ ہے وہ بڑی بلندی والا ہے،اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی بزرگ عرش کا مالک ہے۔﴾ (المومنون ۱۱۵۔۱۱۶)

یعنی یہ کہ حق تعالیٰ شانہ جو بادشاہ حقیقی لاشریک معبود اور رب العرش ہے اس کے بارے میں اس خیال اور گمان کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ اس نے انسانوں کو یوں ہی بے مقصد اور فضول وعبث پیدا کیا ہو، بلکہ اس نے انسانوں کو ایک اہم مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں رہ کر اللہ تعالیٰ کے دربار کی حاضری اور آخرت کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و انعام حاصل کرنے کی تیاری کرے جو اس کی آخری اور انتہائی منزل ہے۔

پس انسان کی یہ دنیاوی چندروزہ زندگی ہی اس کی نشانی اور دلیل ہے کہ اس کے بعد آخرت کی وہ پائیدار اور لافانی زندگی بھی ہونی چاہیے جس کی خبر انبیاء علیہم السلام نے اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں نے دی ہے ورنہ اس دنیا میں انسان کا آنا ایک بے مقصد کھیل اور لاحاصل تماشہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک و برتر ہے۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ اس طرح مخاطب ہے۔

﴿کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے بے کار چھوڑ دیا جائے گا (یعنی اپنے کیے کی جزا سزا نہ پائے گا)۔﴾ (القیمہ ۳۶)

دراصل انسان کی دنیاوی زندگی میں اور یہاں اس کی تخلیق میں معنویت جب ہی ہے جب کہ جزا اور سزا پر ایمان لایا جائے اور اس حقیقت کو مانا جائے کہ یہاں کہ یہ زندگی اگلے عالم کی یعنی آخرت کی اعلیٰ اور ابدی و دوامی زندگی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔اگر اس کو نہ مانا جائے اور آخرت کا انکار کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کی تخلیق جیسے اللہ تعالیٰ کے باعظمت فعل کو بے مقصد تصور کیا جائے، جو کہ سراسر نادانی اور گمراہی ہے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ مرنے کے بعد آدمی بالکل ختم نہیں ہوجاتا،اس کی روح اپنی شخصی خصوصیات کے ساتھ باقی رہتی ہے،صبح وشام اسے اس کا حقیقی ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے،جنت کا منظر دیکھ کر اہل جنت کو جو شادمانی ومسرت ہوگی اس کا اندازہ کرنا ہمارے لیے مشکل ہے،اسی طرح دوزخ دیکھ کر اہل دوزخ کی جو حالت ہوگی اور وہ جس رنج وحسرت میں مبتلا ہوں گے اس کا بھی ہم تصور نہیں کرسکتے۔

قرآن مجید سے بھی اس حدیث کی تائید ہوتی ہے،جیسا کہ سورۃ یٰسین میں آتا ہے۔﴿(اس سے) کہا گیا کہ جنت میں چلا جا،کہنے لگا کاش! میری قوم کو بھی علم ہوجاتا کہ مجھے میرے رب نے بخش دیا اور مجھے باعزت لوگوں میں سے کردیا۔﴾ (۲۶۔۲۷)

ایک اور جگہ اس طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے۔﴿تو جو چال وہ چل رہے تھے اس کی برائیوں سے اللہ نے اس (مردمومن) کو بچالیا اور فرعون کے لوگوں کو برے عذاب نے آگھیرا،آگ ہے جس کے سامنے وہ صبح وشام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن وہ (قیامت کی) گھڑی قائم ہوگی (کہا جائے گا) فرعون کے لوگوں کو سخت عذاب میں داخل کرو۔﴾ (المومن ۴۵۔۴۶)

ان آیات سے بھی بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد انسان بالکل ختم نہیں ہوجاتا،صرف اس کا موجودہ جسم اس سے چھین لیا جاتا ہے،اس کی شخصیت موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے،اسے دکھ سکھ کا احساس ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل وکرم سے اہل جنت میں شامل فرمائے۔آمین!

## میت پر رونے کا بیان

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ابو سیف لوہار کے گھر گئے جو (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے) حضرت ابراہیم کی دایہ کے شوہر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم کو (گود میں) لے کر بوسہ لیا اور سونگھا (یعنی اپنا منہ اور ناک ان کے منہ پر اس طرح رکھا جیسے کوئی خوشبو سونگھتا ہے) اس واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد ہم پھر ابو سیف کے یہاں گئے جب کہ حضرت ابراہیم حالت نزع میں تھے، چنانچہ (ان کی حالت دیکھ کر) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جو ناواقفی سے سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کی چیزوں سے متاثر نہیں ہو سکتے) نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ رو رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا اے ابن عوف! یہ (کوئی بری بات اور بری حالت نہیں بلکہ یہ) شفقت اور دردمندی ہے، پھر دوبارہ آپ کی آنکھوں سے آنسو بہے، تو آپ نے فرمایا: ''آنکھ آنسو بہاتی ہے اور دل مغموم ہے، اور زبان سے ہم وہی کہیں گے جو اللہ کو پسند ہو (یعنی اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، اَللّٰهُمَّ اجِرْنِیْ فِیْ مُصِيْبَتِیْ وَ اخْلُفْ لِیْ خَيْرًا مِنْهَا۔ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہم سب لوٹ کر جانے والے ہیں، اے اللہ! مجھے میری اس مصیبت میں اجر عطا فرما، اور (جو چیز مجھ سے لے لی گئی ہے) اس کے بجائے اس سے بہتر عطا فرما)) اور اے ابراہیم تمہاری جدائی کا ہمیں صدمہ ہے۔''

(بخاری و مسلم)

فائدہ:

کسی عزیز و رشتہ دار اور دوست و متعلق شخص کی دائمی جدائی پر رنج و غم اور حسرت و افسوس کا ہونا ایک فطری بات ہے، مرنے والا جتنا زیادہ قریب اور عزیز ہوگا، رنج و غم کی گھٹائیں اتنی ہی خوفناک ہوں گی، یہ ناممکن ہے کہ اپنے عزیز و متعلقین میں سے کسی کا انتقال ہو جائے اور دل روئے نہیں، آنکھیں آنسو نہ بہائیں اور چہرہ رنج و الم اور حسرت و غم کی تصویر نہ بن جائے، پھر اس فطری رنج و غم کا دوسرا رخ اظہار غم بھی ہے، آنسو بہاتی آنکھیں اس کیفیت کا اظہار کرتی ہیں جو دل پر احساس جدائی کی سیاہ چادر تان دیتی ہے اور چہرہ پر رنج و غم کی برستی ہوئی گھٹا ان جذبات کی ترجمانی کرتی ہے جو رگ رگ میں دائمی فراق کی چنگاری بھر دیتے ہیں۔

ابو سیف کا نام براء تھا اور ان کی بیوی کا نام خولہ بنت المنذر تھا جو انصاریہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی دایہ تھیں ان کا گھرانہ پیشہ کے لحاظ سے لوہار تھا، حضرت ابراہیم صرف سولہ سترہ مہینے کے تھے کہ انتقال کر گئے، چنانچہ اس حدیث میں ان کی حالت بیماری و نزع کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دایہ کے گھر گئے اور انہیں گود میں لے کر پیار کیا اور جب ان کا آخری وقت دیکھا تو رونے لگے اسی وجہ سے حضرت عبدالرحمٰن نے عرض کیا کہ اس قسم کے رقت آمیز مواقع پر لوگ تو روتے ہی ہیں مگر آپ کی عظمت شان اور کمال معرفت سے یہ بعید ہے کہ آپ روئیں، اس کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا کہ یہ شفقت و رحمت اور دردمندی ہے، یعنی میری آنکھیں بے صبری کی وجہ سے آنسو نہیں بہا رہی ہیں جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بچے کو اس حالت میں دیکھ کر جذبہ رحم امنڈ رہا ہے جو آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے بہہ رہا ہے۔

دل مغموم ہے میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص ایسے موقعوں پر بھی غمگین نہ ہو اور اس کا دل غم کی کسک محسوس نہ کرے اس کے سینہ میں دھڑکتا ہوا دل نہیں ہے، بلکہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہے جب کہ نظروں کے سامنے لخت جگر دم توڑ رہا ہو، ایسے نازک موقع پر بھی آنکھیں آنسو نہ بہائیں تو یہ صبر و ضبط نہیں ہے بلکہ احساس محبت و مروت اور جذبہ ترحم کا فقدان ہے، لہذا یہ حال یعنی غمگین ہونا اہل کمال کے نزدیک کامل تر ہے بہ نسبت اس چیز کے کہ بچے کی موت ہو جائے اور چہرہ پر بشاشیت و اطمینان کی لہریں دوڑ رہی ہوں۔

اس حدیث پاک سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک رنج و غم والے حوادث سے رنجیدہ و غمگین ہوتا تھا اور اس حالت میں آپ کی آنکھوں سے آنسو بھی بہتے تھے، اور بلاشبہ یہی انسانیت کا کمال ہے کہ خوشی اور مسرت والی باتوں سے مسرت اور رنج و غم کے موجبات سے رنج و غم ہو، اگر کسی کا یہ حال نہ ہو تو یہ اس کا نقص ہے، کمال نہیں ہے۔

# اللہ تعالیٰ پر توکل

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''حقیقت یہ ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر توکل واعتماد کرو جیسا کہ توکل کا حق ہے تو یقیناً وہ تمہیں اسی طرح روزی دے گا جس طرح کہ پرندوں کو روزی دیتا ہے، وہ (پرندے) صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے (اپنے گھونسلوں) میں واپس آتے ہیں۔''

(ترمذی وابن ماجہ)

فائدہ:

توکل کا حق یہ ہے کہ اول تو اس بات پر پورا یقین واعتقاد ہو کہ کسی بھی چیز کو وجود میں لانے والا اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے، اور ہر شے کو خواہ وہ جاندار ہو یا غیر جاندار مخلوق کا رزق ہو یا کسی چیز کا ملنا ہو یا نہ ملنا ہو، نقصان ہو یا نفع ہو، غربت وافلاس ہو یا ثروت و مالداری ہو، مرض ہو یا صحت ہو، اور موت ہو یا حیات ہو، غرض کہ کوئی بھی چیز ہو، سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور سب چیزیں اسی کی طرف سے ہیں، پھر اس بات کا پختہ اعتقاد ہو کہ رزق کا ضامن بلاشک وشبہ اللہ تعالیٰ ہے، اور پھر اس یقین واعتقاد کے ساتھ حصول معاش کی سعی و جہد میں اچھے طریقوں سے اور مناسب ومعقول صورت میں مشغول ہو، یعنی کسب وکمائی میں زیادہ رنج وفکر نہ کرے، حرص و لالچ میں مبتلا نہ ہو، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے کی جدوجہد نہ کرے اور کمانے کی دھن میں غرق نہ ہو جائے کہ اپنے دنیا میں آنے کی وجہ کو بھول جائے اور حلال وحرام کی تمیز بھی نہ کر سکے۔

اس حدیث کو صحیح سمجھنے کے لیے قرآن پاک کی اس آیت پر غور فرمائیں کہ یہ کیا دعوت دیتی ہے۔

﴿زمین میں چلنے پھرنے والی جو مخلوق بھی ہے اس کی روزی اللہ کے ذمہ ہے۔﴾ (ہود۔۶)

یعنی اللہ تعالیٰ ہی کفیل ہے اور ذمے دار ہے، زمین پر چلنے والی ہر مخلوق، خواہ انسان ہو یا جن، چرند ہو یا پرند، بحری مخلوق ہو یا بری مخلوق، ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق وہ خوراک مہیا کرتا ہے۔

قرآن پاک میں ایک اور جگہ اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

﴿کتنے ہی چلنے والے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے ہوئے نہیں پھرتے، اللہ ہی انہیں رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی، وہ سب کچھ سنتا، جانتا ہے۔﴾ (العنکبوت۔۶۰)

مطلب یہ ہے کہ جانور کسی چیز کو ذخیرہ نہیں کر سکتے، اس لیے رزق کسی خاص جگہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا رزق اپنی مخلوق کے لیے عام ہے وہ جو بھی ہو اور جہاں بھی ہو، یعنی کوئی کمزور ہے یا طاقت ور، اسباب و وسائل سے بہرہ ور ہے یا بے بہرہ، اپنے وطن میں ہے یا بے وطن سب کا روزی رساں وہی اللہ ہے جو چیونٹی کو زمین کے کونوں کھدروں میں، پرندوں کو ہواؤں میں اور مچھلیوں اور دیگر آبی جانوروں کو سمندر کی گہرائیوں میں روزی پہنچاتا ہے۔

قرآن پاک کی ان آیتوں اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنے فرماں بردار بندوں کا ولی اور کارساز ہے، وہ ان کی سرپرستی فرماتا ہے، وہ ان کی ضروریات کو بخوبی سمجھتا ہے، وہ ان کو یتیموں کی طرح بے کسی اور بے چارگی کی حالت میں ہرگز نہیں چھوڑ سکتا، وہ دنیا میں ان کا حاجت روا ہے، مادی ضروریات کی کفالت ہی نہیں وہ تو اپنے وفاداروں کو ایسی حیات عطا کرتا ہے جو نہایت پاکیزہ ہوتی ہے، نہ تو ان کی موجودہ زندگی تاریک ہوتی ہے اور نہ ان کا مستقبل تاریک ہوتا ہے، وہ آگاہ راز ہوتے ہیں ان کی اصل کمائی خدا پرستانہ پاکیزہ زندگی کا شعور ہوتا ہے، وہ رزق طیب وحلال کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن ان کا اصل بھروسہ اپنی کوشش پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر بنی آدم روزی کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ پر ایسا اعتماد اور بھروسہ کریں جیسا کہ انہیں کرنا چاہیے تو اللہ کا معاملہ ان کے ساتھ یہ ہو کہ جس طرح وہ چڑیوں پرندوں کو سہولت سے رزق دیتا ہے کہ انہیں آدمیوں کی سی سخت محنت ومشقت کے بغیر معمولی نقل وحرکت سے روزی مل جاتی ہے، صبح

کو وہ خالی پیٹ نکلتی ہیں اور شام کو پیٹ بھری اپنے آشیانوں میں واپس آتی ہیں،اسی طرح اللہ تعالیٰ ان آدمیوں کو بھی سہولت سے رزق پہنچائے اور انہیں زیادہ سعی وکاوش نہ اٹھانی پڑے جیسا کہ وہ اٹھاتے ہیں۔

مگر یہاں یہ بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ توکل کے معنی حصول رزق کے لیے سعی و کوشش کو ترک کرنا نہیں،مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ رزق حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرے،لیکن اس کا بھروسہ اپنی محنت ومشقت پر نہ ہو بلکہ رب ذوالجلال پر ہو اور اس بات کا اعتقاد رکھے کہ سب معاملات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور رزق صرف اور صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

## غیرت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے،وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''اللہ غیرت مند ہے اور مومن بھی غیرت مند ہوتا ہے،اور اللہ کی غیرت کا تقاضہ یہ ہے کہ مومن اس کام کو نہ کرے جس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔''

(بخاری ومسلم)

فائدہ:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عزت وعظمت بخشی ہے،انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ اس عزت کی قدر و قیمت کو پہچانے اور اسے کسی طرح بھی مجروح نہ ہونے دے،انسان کے اندر غیرت کا جذبہ اسی عزت کی محافظت کے لیے رکھا گیا ہے،جن امور کے ارتکاب سے آدمی کی عزت مجروح ہوتی ہے،اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے لیے حرام قرار دیا ہے،اللہ تعالیٰ صرف یہی نہیں چاہتا کہ انسان کے وجود کی محافظت ہو بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی عزت پر بھی کوئی حرف نہ آئے ،یہ اللہ تعالیٰ کا انتہا درجے کا فضل واحسان ہے،مثلاً اللہ تعالیٰ نے شرک اور زنا کو حرام ٹھہرایا ہے،ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں انسان کی عزت نفس اور اس کے وقار کے خلاف ہیں،جس طرح بدکاری اور زنا ایک ذلیل حرکت ہے،ٹھیک اسی طرح شرک بھی انسان کے لیے ایک فحش اور شرمناک کام ہے۔جس طرح زنا سے انسان کا وقار،اس کی شرافت،اس کی پاک بازی باقی نہیں رہتی ٹھیک اسی طرح سے شرک بھی آدمی سے اس کی عزت چھین لیتا ہے اور اس کی حیثیت ایک آوارہ اور بے آبرو شخص سے زیادہ نہیں رہتی،قرآن پاک نے سورۃ النور میں شرک اور زنا کو ایک ساتھ بیان کر کے یہ اشارہ کیا ہے کہ شرک اور زنا میں کوئی جوہری فرق نہیں ہے،انسان کے لیے دونوں میں یکساں قباحت پائی جاتی ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے نہایت گہرا تعلق ہے،یہی وجہ ہے کہ وہ اسے اپنی غیرت کے خلاف سمجھتا ہے کہ بندے ان کاموں میں ملوث ہوں جو اس کی اپنی عظمت ورفعت کے شایان شان نہیں،اسے بندے کی رسوائی اور تذلیل گوارا نہیں۔

ایک اور حدیث میں اس طرح آتا ہے کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں کسی غیر مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ دیکھوں تو لازماً میں اس پر تلوار سے وار کروں،تلوار کے چوڑے پہلو سے نہیں(بلکہ دھار کی طرف سے)،آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک جب یہ بات پہنچی تو اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا! سعد کی غیرت پر تمہیں تعجب ہے،بخدا میں اس سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ مجھ سے بڑھ کر غیور ہے،اور یہ اللہ کی غیرت ہی ہے جس کی وجہ سے اللہ نے کھلے اور چھپے تمام ہی بے حیائی کے کاموں کو حرام ٹھہرایا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کوئی ازالہ عذر کو پسند کرنے والا نہیں اسی لیے اس نے تنبیہ کرنے والے اور بشارت دینے والے(پیغمبر) بھیجے،اور اللہ سے بڑھ کر کسی کو تعریف بھی پسند نہیں ہوسکتی اسی لیے اللہ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔(بحوالہ بخاری ومسلم)

اللہ تعالیٰ تمام تر حسن وخوبی کا مالک ہے،انسان کے فکر وشعور کی ترقی کا انحصار اس پر ہے کہ اسے اللہ کی صحیح معرفت حاصل ہو،یہ بڑی بدبختی کی بات ہوگی کہ آدمی دنیا میں ساری باتوں کے سلسلے میں واقفیت رکھے لیکن اپنے رب کی صفات اور اس کے جمال وکمال سے بے خبر رہے،بندہ اللہ کی حمد اور تعریف اسی وقت کرسکتا ہے جب کہ اسے اپنے رب کی صحیح پہچان ہو،انسان کیا عقائد ونظریات رکھے اور وہ اپنی زندگی میں کون سا طرز عمل اختیار کرے،اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جو رہنمائی فرمائی ہے وہ اس کا سب سے واضح ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات قابل حمد وستائش ہے،اب اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے

احکام کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ وہ زندگی کے لیے ایسے احکام کا طالب ہے جو وہی دے سکتا ہے جو ہماری تعریف کا مستحق نہ ہو، مثلا! شرک، بے حیائی، جہل، ذلت اور پستی کی تعلیم تو اللہ تعالیٰ دینے سے رہا، اس طرح کی تعلیم تو شیطان ہی کی ہو سکتی ہے جو مردود اور قابل نفرت ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام امت مسلمہ کو حرام اور حلال میں فرق کرنے کی صحیح توفیق عطا فرمائے اور ہر طرح کے حرام کام کے ارتکاب سے محفوظ فرمائے، اور شیطان کی تمام طرح کی شرانگیزیوں سے اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین

## سورۃ آل عمران کی آخری آیات کی فضیلت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ ایک رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سوئے، پس (وقت آجانے پر تہجد کے لیے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے، اور آپ نے مسواک کی اور وضو فرمایا اور پھر آپ اس وقت (سورہ آل عمران کے آخر کی) یہ دعائیہ آیتیں اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ سے آخر سورۃ تک تلاوت فرمائی، پھر آپ نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور آپ نے دو رکعتیں پڑھیں جن میں قیام، رکوع اور سجود بہت طویل کیا، پھر آپ بستر کی طرف واپس آئے اور (ذرا دیر کے لیے) سو گئے، یہاں تک کہ آپ کی سانس آواز کے ساتھ چلنے لگی، اس کے بعد آپ نے تین دفعہ ایسا ہی کیا (یعنی تین دفعہ ایسا کیا کہ ذرا دیر سونے کے بعد اٹھے مسواک کی، وضو فرمایا، اور طویل قیام، رکوع وسجود کے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں) اس طرح آپ نے (پہلی دو رکعتوں کے علاوہ) چھ رکعتیں پڑھیں اور ہر دفعہ اٹھ کر مسواک کرتے اور وضو فرماتے اور آل عمران کے آخر کی یہ آیتیں پڑھتے تھے، پھر آپ نے تین رکعت نماز وتر پڑھی۔''

(مسلم)

فائدہ:

اس حدیث پاک سے جہاں ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز تہجد میں طویل قیام، رکوع وسجود اور اس کے بعد وتر کی ادائیگی کرنے کا معلوم ہوتا ہے وہیں سورۃ آل عمران کی آخری آیتوں کی فضیلت کا بھی بخوبی پتہ چلتا ہے۔

سورۃ آل عمران کی اس آیت اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ کے شان نزول سے متعلق ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور محدث ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ عطاء بن ابی رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں جو سب سے زیادہ عجیب چیز آپ نے دیکھی ہو وہ مجھے بتلایئے، اس پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: آپ کی کس شان کو پوچھتے ہو؟ ان کی تو ہر شان عجیب ہی تھی، ہاں ایک واقعہ عجیب سناتی ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات کہا، عائشہ مجھے چھوڑو، آج کی رات اپنے پروردگار کی عبادت کروں، میں نے (یعنی حضرت عائشہ) نے کہا، (اللہ کے رسول) مجھے آپ کے پاس رہنا بھی پسند ہے اور جس میں آپ خوش ہوں، چنانچہ آپ اٹھے اور وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ آپ نے مسلسل رونا شروع کیا، یہاں تک کہ اپنی گود (آنسوؤں سے) تر کر لی، پھر کہتی ہیں آپ (نماز میں) بیٹھے ہوئے روتے رہے یہاں تک کہ اپنی داڑھی تر کر لی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ پھر آپ برابر روتے رہے یہاں تک کہ زمین بھی تر کر لی اتنے میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کو (فجر کی) نماز کے لیے بلانے آ گئے، انہوں نے جب آپ کو روتے ہوئے دیکھا تو عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ روتے ہیں؟ آپ کے تو اللہ تعالیٰ نے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیئے ہیں، آپ نے فرمایا: تو کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ آج ہی کی رات میرے اوپر ایک آیت نازل ہوئی ہے، اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ... الۡاَلۡبَابِ۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: بڑی تباہی ہے اس شخص کے لیے جس نے اس آیت کو پڑھا اور ان میں غور وفکر نہیں کیا۔

ہر مسلمان کو اس آیت کے معنی، مطلب، اس کے مضمون کی وسعت اور گہرائی اور اس آیت کے تقاضوں پر اپنی اپنی عقل وبصیرت کی حد تک خوب غور کرنا

چاہیے۔
سورۃ آل عمران کی آخری آیتوں کی فضیلت کا اندازہ اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے۔
حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی رات کو آل عمران کی آخری آیات پڑھے گا اس کے لیے پوری رات کی نماز کا ثواب لکھا جائے گا۔(بحوالہ دارمی)
سورۃ آل عمران کا یہ آخری رکوع بھی سورۃ البقرۃ کے آخری رکوع کی طرح نہایت جامع دعا پر مشتمل ہے،اور غالباً اس رکوع کی فضیلت کا راز ان دعائیہ آیات ہی میں مضمر ہے،کائنات کی تخلیق میں تفکر کرنے والے اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والے بندوں کی زبان سے یہ جامع دعا اس رکوع میں اس طرح کی گئی ہے۔
رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً......اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۔(۱۹۱۔۱۹۴)
سورۃ آل عمران کے آخری رکوع کی یہ دعا قرآن مجید کی جامع ترین چند دعاؤں میں سے ہے۔

## سفارش کی حقیقت

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''مومن مومن کے لیے عمارت کی طرح ہوتا ہے،جس کا ایک حصہ دوسرے کو تقویت پہنچاتا ہے۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیوں کو باہم ملا کر دکھایا۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہی تھے کہ ایک شخص کچھ مانگنے کو یا حاجت لے کر آیا،آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا:''(تم اس ضرورت مند کی مجھ سے) سفارش کرو(کہ آپ اس کی ضرورت پوری کر دیں) تمہیں (بھی سفارش کا) اجر وثواب حاصل ہوگا،اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان پر جو چاہتا ہے حکم جاری فرماتا ہے۔''
(بخاری ومسلم)

فائدہ:

اس حدیث شریف سے ایک بات معلوم ہوئی کہ کسی مسلمان کا دوسرے مسلمان کے کام کے سلسلے میں سفارش کرنا بڑے اجر وثواب کا کام ہے لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ سفارش کرنے والے کی نیت صرف بھلائی اور خیر خواہی کی ہو،جس کے ذریعے اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے،نہ کہ نام ونمود یا کوئی اور مفاد پیش نظر ہو۔یہ درحقیقت اسلامی مزاج کے عین مطابق ہے جو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کی ترغیب دیتا ہے اور جس میں تمام مسلمان رنگ،زبان،نسل کے فرق کے باوجود بھائی بھائی ہیں۔
کسی کی سفارش کرنا گویا اس کے ساتھ ہمدردی کرنا اور اس کی مدد کرنا ہے اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ تم لوگوں کی سفارش کرتے رہا کرو،خواہ تمہاری سفارش قبول کی جائے یا نہ کی جائے کیوں کہ کسی کا کام ہونا یا نہ ہونا تقدیر الٰہی اور حکم خداوندی کے مطابق ہے لہٰذا تم اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ شاید میری سفارش قبول نہ ہو،سفارش کرنے سے اجتناب نہ کرو اور اس کا ثواب ہاتھ سے جانے نہ دو۔
لیکن جہاں اس کام میں اجر وثواب ہے وہیں اس کے کچھ آداب بھی ہیں جن کا خیال نہ رکھا جائے تو یہی نیک کام وبال جان بھی بن سکتا ہے۔چنانچہ یہ جاننا ضروری ہے کہ سفارش کا مقصد کیا ہونا چاہیے،سفارش کن موقعوں اور کن کاموں کے لیے کرنی چاہیے۔مزید یہ کہ سفارش کا طریقہ کیا ہونا چاہیے۔
علمائے کرام نے واضح فرمایا ہے کہ سفارش کا مقصد یہ ہے کہ جس کے پاس سفارش کی جا رہی ہے اس کو توجہ دلائی جائے۔اس کو اس بات کی طرف توجہ دلانا ہے کہ یہ کام اور موقع بھی قابل توجہ ہے نہ کہ اس پر دباؤ ڈالنا جیسا کہ آج کل سفارش کی حیثیت بن گئی ہے۔سفارش کی ایک حیثیت مشورہ کی ہے یعنی سفارش کرنے والا جس سے سفارش کی جا رہی ہے اس کو ایک مشورہ دے رہا ہے۔اور دین اسلام میں مشورہ ایک امانت ہے کہ جس کو پورا پورا ادا کیا جائے اور جس بات کو وہ سب سے بہتر سمجھتا ہے وہ مشورہ لینے والے کو بتا دے۔لیکن جس کو مشورہ دیا جائے اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ مشورے کو مانے۔اس کو اختیار ہے کہ چاہے تو مشورے کو رد کر دے اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین نے اپنے

اس اختیار کو استعمال کیا اور دو جہاں کے سردار نے اس بات کا ذرا برا نہیں مانا، ہمارے لیے بھی ان کی اتباع میں یہی فلاح اور عافیت کا ذریعہ ہے کہ سفارش کے رد ہو جانے کی صورت میں ناگواری بالکل نہ ہو۔

سفارش ہمیشہ جائز اور صحیح کاموں کی ہونی چاہیے۔ کسی ناجائز کام کی سفارش کرنا بھی ناجائز ہے چنانچہ کسی نا اہل کے لیے اپنی حیثیت کا استعمال کرتے ہوئے کسی محکمے میں بھرتی کرا دینا ناجائز ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿جو شخص نیک بات کی سفارش کرے تو اس کے (ثواب میں) سے حصہ ملے گا اور جو بری بات کی سفارش کرے گا اس کو اس (کے عذاب) میں سے حصہ ملے گا۔﴾ (النساء-۸۵)

یعنی جہاں جائز سفارش اجر و ثواب کا ذریعہ ہے وہیں ناجائز سفارش کرنے والا اس گناہ میں برابر کا شریک ہے۔

سفارش میں اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ جس کے پاس سفارش کی جا رہی ہے اس کو مشکل اور پریشانی نہ ہو۔ اس لیے کہ بعض اوقات سفارش کا قبول کرنا مصلحت کے خلاف ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سفارش کرے اور چاہے کہ ہر حال میں یہ کام ہو جائے تو ظاہر ہے کہ جس سے سفارش کی جا رہی ہے اس کو اپنی مصلحت کے خلاف کام کرنا پڑے گا جو اس کے لیے ذہنی پریشانی کا سبب ہوگا۔

## دیدار الٰہی اور نعمتوں کا سوال

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ بعض صحابہ کرام نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا قیامت کے روز ہم اپنے پروردگار کو دیکھیں گے؟ آپ نے فرمایا: ''کیا دو پہر کے وقت میں سورج کے دیکھنے میں، جب کہ وہ بادل میں بھی نہ ہو، تم میں کوئی کشمکش ہوتی ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا: ''کیا چودھویں رات کے چاند کے دیکھنے میں جب کہ وہ بادل میں نہ ہو، تم میں کوئی کشمکش اور کوئی مشکل ہوتی ہے؟ انہوں نے عرض کیا نہیں۔ اس کے بعد رسول اللہ نے ارشاد فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی، جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم جس طرح چاند اور سورج کو بلا کسی کشمکش اور بغیر کسی اختلاف اور مشکل کے دیکھتے ہو، اسی طرح قیامت میں اپنے پروردگار کو دیکھو گے۔'' اس کے بعد رسول اللہ نے فرمایا کہ: ''قیامت میں جب اللہ سے ایک بندے کا سامنا ہوگا، تو اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا، اے فلاں کیا میں نے دنیا میں تجھے عزت نہیں دی تھی، کیا تجھے تیری قوم میں سرداری نہیں دی تھی، کیا تجھے بیوی نہیں عطا کی تھی، اور کیا تیرے لیے گھوڑے اور اونٹ (سواریوں) کو مسخر نہیں کیا تھا، اور کیا میں نے تجھے چھوڑے نہیں رکھا تھا کہ تو ریاست اور سرداری کرے، اور مال غنیمت میں سے چوتھائی وصول کرے، وہ بندہ عرض کرے گا، ہاں! اے پروردگار آپ نے یہ سب کچھ مجھے عطا فرمایا تھا، پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا، تو کیا تجھے اس کا خیال اور گمان تھا کہ تو ایک دن میرے سامنے آئے گا؟ وہ عرض کرے گا، میں یہ خیال نہیں کرتا تھا، پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا، آج میں تجھے اپنے رحم و کرم سے اسی طرح بھلاتا ہوں، جس طرح تو نے مجھے بھلائے رکھا تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے دوسرے ایک بندے کا سامنا ہوگا، اور اس سے بھی اللہ تعالیٰ اسی طرح فرمائے گا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ تیسرے ایک بندے سے ملیں گے، اور اس سے بھی اسی طرح فرمائیں گے، یہ بندہ عرض کرے گا کہ اے پروردگا! میں تجھ پر ایمان لایا، اور تیری کتاب پر اور تیرے رسولوں پر ایمان لایا، اور میں نے نمازیں پڑھیں اور روزے رکھے اور صدقہ بھی ادا کیا (اور اس کے علاوہ بھی) وہ بندہ خوب اپنے اچھے کارنامے بیان کرے گا، جہاں تک بھی بیان کر سکے گا، پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا، یہاں ٹھہر! پھر اس سے کہا جائے گا، کہ ہم ابھی تجھ پر ایک گواہ قائم کرتے ہیں، اور وہ اپنے دل میں سوچے گا کہ وہ کون ہوگا جو مجھ پر گواہی دے گا، پھر اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اس کی ران کو حکم دیا جائے گا کہ بول تو اس کی ران اور اس کا گوشت، اور اس کی ہڈیاں اس کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ یہ اس لیے کرے گا کہ اس کا عذر باقی نہ رہے اور یہ منافق ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوگا۔''

(مسلم)

فائدہ:

اس حدیث پاک میں دریافت کرنے والے نے صرف اتنا ہی پوچھا تھا کہ کیا قیامت میں ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکیں گے؟ آپ نے سورج اور چاند کی مثال

دے کر یہ سمجھایا کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کا دیکھنا اتنا واضح طریقہ پر ہوگا جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہوگی ،ساتھ ہی آپ نے یہ بھی واضح فرمایا کہ جس طرح چاند اور سورج کو مشرق ومغرب کے انسان بیک وقت دیکھتے ہیں،اور بالکل یکساں طور پر دیکھتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی کشمکش نہیں ہوتی،اسی طرح قیامت میں سب اللہ تعالیٰ کو بھی دیکھ سکیں گے، پھر مزید آپ نے یہ بھی فرمادیا کہ بعض لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بڑی بڑی نعمتیں دے رکھی ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کو بالکل بھولے ہوئے ہیں،اور آخرت کی پیشی سے بالکل غافل ہوگئے ہیں،جب قیامت میں اللہ تعالیٰ سے ان کا سامنا ہوگا اور اللہ تعالیٰ ان سے بازپرس کرے گا تو اس دن وہ کیسے لاجواب اور کیسے ذلیل وخوار ہوں گے،اور ان میں سے جو دیدہ ور اور بے حیا منافق اس وقت غلط بیانی کریں گے،اللہ تعالیٰ خود انہیں کے اعضاء سے اور انہیں کے گوشت اور انہیں کی ہڈیوں سے ان کے خلاف گواہی دلوا کر ان پر حجت قائم فرمادیں گے،اور اس طرح ان کے جھوٹ اور ان کی منافقت کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

رسول اللہ نے اصل سوال سے زائد یہ بیان ،سوال کرنے والے صحابہ کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے فرمایا کہ قیامت میں صرف اللہ تعالیٰ کا دیدار ہی نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ نے جس کسی کو بھی جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان کے متعلق دریافت بھی کرے گا جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

﴿پھر اس دن تم سے ضرور بالضرور نعمتوں کا سوال ہوگا۔﴾ (التکاثر۔۸)

یہ سوال ان تمام نعمتوں کے متعلق ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں عطا فرمائی ہیں،خواہ ان کا تعلق کھانے پینے سے ہو یا لباس سے ہو اور مکان سے یا بیوی اور اولاد سے یا حکومت وعزت سے یا صحت ومال ودولت سے۔

اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام سے بے پرواہ ہوکر اور آخرت کی پیشی سے بےفکر ہوکر ان نعمتوں کو دنیا میں بے جا استعمال کیا ہوگا وہ اس روز ذلیل و رسوا ہوں گے اور وہاں کسی کی مکاری اور عیاری بالکل پردہ پوشی نہ کرسکے گی۔

## دوزخ کی آگ کی گرمی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''تمہاری (دنیا) کی آگ دوزخ کی آگ کے ستر (۷۰) حصوں میں سے ایک ہے،عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ! یہ تو دنیا کی آگ ہی (عذاب دینے کے لیے) کافی تھی (پھر اس سے بھی زیادہ حرارت اور تپش رکھنے ولی آگ پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟) آپ نے فرمایا:''دوزخ کی آگ دنیا کی آگ کے مقابلہ میں انہتر (۶۹) درجہ بڑھا دی گئی ہے،اور انہتر درجوں میں ہر ایک درجہ کی حرارت آتش دنیا کی حرارت کے برابر ہے۔''

(بخاری ومسلم)

فائدہ:

دنیا کی آگ کا دوزخ کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی آگ جو درجہ حرارت رکھتی ہے،دوزخ کی آگ اس سے ستر حصے درجہ حرارت زیادہ گرم ہے،لیکن ہوسکتا ہے کہ ستر کے عدد سے مراد دنیا کی آگ کے مقابلہ میں دوزخ کی آگ کی گرمی کی شدت وزیادتی کو بیان کرنا ہو نہ کہ یہ خاص عدد ہی مراد ہے، کیونکہ عربی زبان میں کسی چیز کی زیادتی اور کثرت کو ظاہر کرنے کے لیے بھی ستر کے عدد کو استعمال کیا جاتا ہے، گویا اصل مفہوم یہ ہوگا کہ دوزخ کی آگ تمہاری دنیا کی آگ کے مقابلہ میں بہت زیادہ درجہ حرارت رکھتی ہے اور دوزخ کی آگ اپنی گرمی میں اور جلانے کی صفت میں دنیا کی آگ سے بہت زیادہ شدید ہے۔

اس دنیا میں آگ کی مختلف قسموں میں بھی درجہ حرارت میں فرق پایا جاتا ہے،مثلاً لکڑی کی آگ میں گھاس پھونس کی آگ سے زیادہ گرمی ہوتی ہے،اور پتھر کے کوئلے کی آگ میں لکڑی کی آگ کے مقابلے میں بہت زیادہ حرارت ہوتی ہے،اور لوہے کہ آگ میں ان تمام چیزوں کی آگ کے مقابلے میں درجہ حرارت کہیں اور زیادہ ہوتی ہے،اور اب تو آلات سے یہ معلوم کرنا آسان ہوگیا ہے کہ ایک آگ دوسری آگ کے مقابلہ میں کتنے درجہ کم یا زیادہ گرم ہے۔

آپ سے جو سوال کیا گیا، اس کے جواب میں آپ نے جو فرمایا وہ گویا ازراہ تاکید اسی جملہ کی تکرار تھی جو آپ نے شروع میں فرمایا تھا اور اس سے جواب کا حاصل یہ نکلا کہ بے شک کسی کو جلانے کے لیے اس دنیا کی آگ ہی بہت ہے کہ اگر تم کسی انسان کو عذاب میں مبتلا کرنے کے لیے اس آگ میں ڈال دو تو وہ جل کر کوئلہ ہوجائے گا مگر دوزخ کی آگ جس عذاب خداوندی کے لیے تیار کی گئی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس کی حرارت وگرمی اس دنیا کی آگ کی حرارت وگرمی سے بہت زیادہ ہو، تاکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب دنیا والوں کے عذاب سے ممتاز رہے اور دوزخ کی اس آگ میں جلنے والوں کو معلوم ہو کہ ان کے رب کا عذاب اتنا زیادہ شدید اور اتنا زیادہ سخت ہے کہ اگر دنیا میں کوئی شخص انہیں وہاں کی آگ میں جلاتا تو وہ عذاب اس عذاب خداوندی کے مقابلہ پر ہیچ ہوتا، حاصل یہ ہے کہ دوزخ کی آگ دراصل عذاب خداوندی ہے اس لیے اس کو دنیا کی آگ کی بہ نسبت کہیں زیادہ درجہ حرارت رکھنا ہی چاہیے۔ جہنم میں سب سے بڑا عذاب آگ کا ہی ہوگا جس کے متعلق ارشاد ربانی ہے﴿بہت بری آگ ہے﴾ (اعلیٰ ۱۲)

کیونکہ جہنم کی آگ تو کافروں اور مشرکوں کو مستقل عذاب دینے کے لیے بھڑکائی گئی ہے لہذا دنیا کی آگ سے کئی درجہ زیادہ گرم ہونے کے باوجود یہ آگ جہنمیوں کا قصہ تمام نہیں کرے گی بلکہ انہیں مسلسل عذاب اور عتاب میں مبتلا رکھے گی، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔﴿نہ جان لے گی نہ جان چھوڑے گی۔﴾ (مدثر ۲۸) ایک دوسری جگہ اس طرح ارشاد ہے۔﴿اس آگ میں کافر نہ مرے گا نہ زندہ رہے گا۔﴾ (طہٰ ۷۴)

انسان کی قوت برداشت کا عالم تو یہ ہے کہ جون جولائی کے موسم میں گرمی اور لو برداشت کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی، کمزور، بیمار اور بوڑھے لوگوں کی اموات تک واقع ہونے لگتی ہیں، عذاب الیم کی ایسی بدترین جگہ پر اس انسان کی زندگی کیسی ہوگی جو اپنی ہتھیلی پر چھوٹا سا آبلہ برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتا؟

اس حدیث سے امت کو یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ ہمیں ہر وقت اللہ تعالیٰ کے جلال اور قہر سے ڈرنا اور آتش دوزخ سے بچنے کی فکر کرنی چاہیے۔

ایک اور روایت سے دوزخ کی آگ کی شدت کا اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ دوزخ کی آگ کو ایک ہزار برس جلایا گیا یہاں تک کہ وہ سفید ہوگئی، پھر ایک ہزار برس اور جلایا گیا جس سے وہ سیاہ ہوگئی پس اب دوزخ کی آگ بالکل سیاہ وتاریک ہے (جس میں نام کو بھی روشنی نہیں ہے) (بحوالہ ترمذی)

## کلمہ خیر اور کلمہ شر کی اہمیت

حضرت بلال بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''آدمی کوئی کلمہ خیر اپنی زبان سے ادا کرتا ہے اور اسے اس کی قدر و منزلت کا علم نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ اس کے سبب اس کے لیے اپنی رضا اور خوشنودی اس دن تک کے لیے لازم کردیتا ہے جب کہ وہ اس سے ملاقات کرے گا، اور اسی طرح آدمی کلمہ شر اپنی زبان سے ادا کرتا ہے اور اسے اس کی حقیقت کا اور اس کے انجام کا علم نہیں ہوتا، اور ہوتا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سبب اس پر اپنے غیض وغضب کو اس دن تک کے لیے لازم کردیتا ہے جب کہ وہ اس سے ملے گا۔''

(ترمذی، مالک وشرح السنہ)

فائدہ:

اس حدیث پاک میں زبان کی خوبی اور خرابی دونوں چیزیں بتائی گئی ہیں، ایک کلمہ کتنا قیمتی ہوسکتا ہے اور کس قدر ضرر رساں اور نقصان دہ ہوسکتا ہے، دونوں کا اندازہ حدیث بالا سے واضح طور پر لگایا جاسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا نام لینا، اللہ تعالیٰ کی بات کسی کو پہنچا دینا، کسی مظلوم کی فریادرسی کے لیے کوئی کلمہ کہہ دینا، کسی ظالم بادشاہ کے سامنے حق کہہ دینا ان سب چیزوں سے بڑے بڑے درجات حاصل ہوجاتے ہیں، بعض اوقات دھیان بھی نہیں ہوتا اور انسان کی زبان سے خیر کے کلمات نکل جاتے ہیں اور اونچے درجات کا سبب بن جاتے ہیں، اس کے برعکس یہ بھی ہے کہ غفلت اور بے دھیانی میں زبان سے بعض مرتبہ ایسا کلمہ نکل جاتا ہے جو انسان کو ہلاکت کی گہرائیوں میں دھکیل کر دوزخ میں پہنچا دیتا ہے اور یہ معمولی گہرائی نہیں ہوتی بلکہ ایک روایت کے مطابق اس کی گہرائی مشرق ومغرب کے درمیان جو فاصلہ ہے اس سے بھی زیادہ اس گہرائی کا فاصلہ ہوتا ہے (بحوالہ بخاری)۔

ساتھ ہی حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی وقتی اور عارضی نہیں ہوتی، قیامت کے دن یعنی یوم آخر تک کے

لیے ہوتی ہے، بعد ازاں اس پر اللہ تعالیٰ کی جو عنایتیں اور رحمتیں ہوں گی ان کا کیا کہنا، ان سے تو وہ براہ راست فیض یاب ہوگا، یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اسے دنیا میں نیک اعمال کی توفیق ملتی رہتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کو برزخ میں قبر کے عذاب سے محفوظ رکھتا ہے اس کی قبر کو کشادہ کردیا جاتا ہے پھر وہ قیامت کے دن نیک بختی وسعادت کے ساتھ اٹھے گا کہ اس پر حق تعالیٰ کی رحمت کا سایہ ہوگا جنت میں داخل کیا جائے گا اور وہاں کی نعمتیں اس کا نصیب بنیں گی۔

اس کے برعکس وہ شخص جس کی زبان سے نکلی ہوئی بات اللہ تعالیٰ کے غضب کو بھڑکا دیتی ہے، اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا غصہ اور غضب وقتی اور عارضی نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ قیامت تک اس پر غضب ناک رہتا ہے، بعد کا کیا ذکر، جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ اس کے لیے کافی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ دنیا میں توبہ کر کے کوئی اپنی اصلاح کرلے، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ بدل جاتا ہے، وہ اس کی خطاؤں کو معاف فرما کر کے اپنا مقرب بندہ بنا سکتا ہے، توبہ کا دروازہ بہرحال ہر ایک کے لیے کھلا ہے۔

حدیث پاک میں جو فرمایا گیا ہے ''اس دن کے لیے لازم کردیتا ہے جب کہ وہ اس سے ملے گا'' تو اس کا یہ مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا یا اس کی خفگی بس اسی دن تک محدود رہے گی، اس کے بعد منقطع ہوجائے گی، اس کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے فرمایا۔

﴿اور تیرے اوپر یوم الجزا تک میری لعنت ہے۔﴾ (ص ۔۷۸)

اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں کہ یوم الجزا کے بعد ابلیس لعنت کی گرفتاری سے چھوٹ جائے گا، یوم الجزا تک تو اس پر لعنت اور اللہ تعالیٰ کی پھٹکار ہے ہی اس کے آگے اس لعنت کے ساتھ عذاب جہنم کا اضافہ بھی ہوجائے گا، جسے ابلیس اور اس کے پیروکار خود دیکھ لیں گے، اسی طرح حدیث میں مذکورہ لوگوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی یا خفگی کا تعلق موت کے دن کے بعد بھی ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

## سید الاستغفار

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''افضل استغفار (سب سے اعلیٰ استغفار) یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور یوں عرض کرے: اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَ اَنَا عَبْدُکَ وَ اَنَا عَلٰی عَھْدِکَ وَ وَعْدِکَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَکَ بِنِعْمَتِکَ عَلَیَّ وَ اَبُوْءُ بِذَنْبِیْ فَا غْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ فَاِنَّه لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ۔ (اے اللہ! تو ہی میرا پروردگار ہے، تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں تو نے مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں، میں تیرے عہد پر ہوں (یعنی عہد میثاق پر قائم ہوں) اور تیرے وعدے پر ہوں (یعنی تو نے حشر وغیرہ کے بارے میں جو وعدہ کیا ہے اس پر یقین کامل رکھتا ہوں) میں اپنی طاقت کے بقدر اس برائی (یعنی گناہ سے) تیری پناہ چاہتا ہوں جس میں میں مبتلا ہوا، میں تیری نعمتوں کا جو تو نے مجھے عنایت فرمائیں اقرار کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا بھی اعتراف کرتا ہوں، پس تو مجھے بخش دے، کیونکہ گناہوں کو تیرے علاوہ کوئی نہیں بخشتا)۔'' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص ان کلمات کو اخلاص کے ساتھ دن میں ان کے معنی پر یقین رکھ کر پڑھے اور پھر اسی دن شام سے پہلے مرجائے تو وہ جنتیوں میں سے ہے، اور جو شخص ان کلمات کو اخلاص کے ساتھ رات میں ان کے معنی پر یقین رکھ کر پڑھے اور پھر اسی رات صبح ہونے سے پہلے مرجائے تو وہ جنتیوں میں سے ہے۔''

(بخاری)

فائدہ:

استغفار کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی کمزوری اور بندگی کا اعتراف کرے، اپنی کوتاہیوں اور اپنے جرائم کو تسلیم کرے اور اس کی بڑائی کا اقرار کرکے اس کے سامنے دل سے جھک جائے اور سچے دل سے معافی مانگ لے، اس استغفار کی اس غیر معمولی فضیلت کا راز بظاہر یہی ہے کہ اس میں یہ تمام چیزیں پوری طرح موجود ہیں اور اس کے ایک ایک لفظ میں عبدیت کی روح بھری ہوئی ہے۔

''عہد'' سے مراد بعض علماء کے نزدیک روز ازل کا عہد و پیمان اور ''وعد'' سے مراد اسلام کی تعلیمات کو ماننے اور ان پر چلنے کا وعدہ ہے اور اس میں بھی ''مَا اسْتَطَعْتُ'' کہہ کر اپنی کمزوریوں کا اقرار ہے کہ پروردگار تیرے حکموں کی پوری پوری پابندی تو میں کیا کرسکتا ہوں، ہاں جہاں تک مجھ سے ہوسکے گا میں تیرے وعدے پر قائم رہوں گا، حق یہ ہے کہ جس صاحب ایمان بندے کو وہ معرفت و بصیرت ہو جس کے ذریعہ وہ اپنی اور اپنے اعمال کی حقیقت کو سمجھتا ہو اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت اور اس کے حقوق کو بھی کچھ جانتا ہو تو وہ اپنے کو صرف قصوروار اور گناہ گار اور خیر و بھلائی کے معاملہ میں بالکل مفلس اور تہی دامن محسوس کرے گا اور پھر اس کے دل کی آواز اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس کی التجا یہی ہوگی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم فرمائے ہوئے اس استغفار میں محسوس ہوتی ہے، انہی تمام خوبیوں کی وجہ سے اس کا نام سید الاستغفار ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہنچ جانے کے بعد آپ پر ایمان رکھنے والے ہر امتی کو چاہیے کہ وہ اس کا اہتمام کرے کہ ہر دن اور رات میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور سچے دل سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ استغفار کرلیا کرے، سید الاستغفار کا پورا فائدہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان الفاظ کو کہتے وقت ان کے معنی کا خوب اچھی طرح دھیان ہو، نیت بالکل درست ہو، توجہ کامل اور دعا و استغفار کے آداب کی پوری رعایت ہو۔

## کسی کی آخرت کے متعلق حتمی رائے نہ دو

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین میں سے ایک شخص کا انتقال ہوا تو ایک شخص نے کہا کہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے) تجھے بشارت ہو جنت کی، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کیا کہہ رہے ہو جب کہ حقیقت حال سے تم واقف نہیں ہو، شاید اس نے لایعنی گفتگو کی ہو یا ایسی چیز میں بخل سے کام لیا ہو جو اس کے لیے باعث نقصان نہ تھی۔''

(ترمذی)

فائدہ:

حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دینے والے صاحب کو تنبیہ فرمائی کہ تم کیسے یقین کے ساتھ اس کو جنتی کہہ رہے ہو، ہر شخص کے پورے احوال و افعال اور اعمال و اشغال ہر ایک کے سامنے نہیں ہوتے، لہذا یقین کے ساتھ ایسی بات نہ کہی جائے جس سے غیب دانی کا دعوی ہو، البتہ مرنے والے کے لیے دعا اور استغفار کرے اور اس کی خوبیاں بیان کرے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے اس کے لیے بہتری کی امید رکھے۔

حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرماتے ہوئے دو ایسی باتوں کا ذکر فرمایا جو جنت میں جانے سے روک سکتی ہیں، ان میں سے ایک یہ کہ ممکن ہے اس نے کوئی لایعنی بات کہی ہو، اس سے معلوم ہوا کہ دین و اخلاق کا معاملہ کس درجہ نازک ہے، کوئی شخص جرم عظیم کا مرتکب نہ بھی ہوا ہو لیکن اس کی لایعنی اور بیہودہ گفتگو بھی جنت کے داخلے میں رکاوٹ بن سکتی ہے، لاحاصل اور بے ہودہ گفتگو سے بھی انسان کی پوزیشن خراب ہوسکتی ہے اور وہ گرفتار مصیبت ہوسکتا ہے، اس لیے پورے یقین کے ساتھ کسی کے سیدھے جنتی ہونے کا اعلان تقویٰ کے منافی ہے۔

لایعنی بات یعنی غیر ضروری بات یا بے جا گفتگو اس کے متعلق ایک حدیث میں ان باتوں کو چھوڑ دینا ہی اسلام کی خوبی اور حسن بتایا گیا ہے۔ انسان کے اسلام کی خوبی اور حسن یہ ہے کہ جو بات اس کے لیے مفید اور ضروری نہ ہو اس کو چھوڑ دے۔ (بحوالہ ترمذی و ابن ماجہ)

لایعنی اس کو کہتے ہیں جس سے دنیا اور آخرت کا فائدہ نہ ہو، اس میں وہ باتیں بھی داخل ہیں جو دنیا و آخرت کے نقصان کا باعث ہوں اور وہ بھی داخل ہیں جن میں نہ نقصان ہو نہ نفع ہو، جن چیزوں میں نقصان ہے اور مواخذہ و عذاب ہے ان سے بچنا تو ہر انسان کی عقل کا تقاضا ہے، لیکن جو باتیں ایسی ہوں جن سے نہ نفع ہو نہ نقصان ہو وہ بھی نقصان کی باتیں ہیں کیونکہ جتنی دیر ایسی باتیں کیں اتنی دیر اللہ کا نام لیا جا سکتا تھا تلاوت کی جا سکتی تھی، درود شریف پڑھا جا سکتا تھا یا استغفار کی جا سکتی تھی، لہذا اس منافع کا ضائع ہونا ہی دراصل نقصان اور خسران ہے۔ پھر لایعنی اور فضول باتیں شروع کرنے سے بات بڑھتے بڑھتے لوگوں کی برائیوں اور غیبتوں تک نوبت پہنچ جاتی ہے اس لیے خیر اسی میں ہے کہ بندہ بلاوجہ نہ بولے، خاموش رہے یا اللہ کا ذکر کرے اور بقدر ضرورت دنیا کی باتیں کرے جو جائز امور سے متعلق ہوں زیادہ کلام دل میں سختی پیدا کرتا ہے، اس لیے فضول اور لایعنی کلام سے بچنے کی سخت

ضرورت ہے۔

دوسری بات یہ کہ ہوسکتا ہے اس نے ایسی چیز کے خرچ کرنے میں کنجوسی کی ہو جو خرچ کرنے سے گھٹتی نہیں، مثلاً کوئی علم کی بات کسی نے پوچھی ہو اور معلوم ہوتے ہوئے نہ بتائی ہو یا فرض زکوٰۃ دینے میں کنجوسی کی ہو یا دوسرے صدقات اور نفقات جن کا خرچ کرنا ضروری ہو، ان میں خرچ کرنے سے گریز کیا ہو، کیونکہ علم کو تقسیم کرنے، زکوٰۃ کی ادائیگی کرنے سے علم اور مال میں کوئی کمی نہیں ہوتی بلکہ ان میں اضافہ ہی ہوتا ہے، ایسی چیزوں میں بخل سے کام لے کر کوئی بھی انسان اپنی پستی اور کم ظرفی کا ثبوت فراہم کرتا ہے جس میں انسان کے لیے نقصان کی کوئی بات نہیں ہوتی، مثلاً سلام کرنا، خندہ پیشانی کے ساتھ بھائی کا استقبال کرنا، اس طرح کا بخل انسان اور اس کی جنت کے درمیان رکاوٹ بن سکتا ہے۔

صدقات اور نفقات کو ان چیزوں میں شمار کیا گیا ہے جن سے مال گھٹتا نہیں کیونکہ ان سے مال بظاہر گھٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں بڑھتا ہے، قرآن وحدیث سے یہ بات ثابت ہے صدقہ اور بھلائی کے دوسرے کاموں میں اللہ تعالیٰ نے برکتیں ہی رکھی ہیں، جیسا کہ ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔﴿تم جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اللہ اس کا (پورا پوار) بدلہ دے گا۔﴾ (سبا ۳۹)

حدیث میں اس طرح آتا ہے کہ۔خرچ کرو تم پر خرچ کیا جائے گا۔ (بحوالہ بخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ تم نے اس شخص کے جنت میں جانے کے بارے میں اس طرح یقین کیوں ظاہر کیا ہے، جب کہ تمہیں اس کی زندگی کے سارے ظاہری و باطنی گوشوں سے واقفیت اور اس کے احوال کی حقیقت کا علم نہیں ہے، بے شک اس شخص کی ظاہری زندگی بڑی پاکیزہ تھی اور اس کو صحابیت کی سعادت بھی حاصل ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ اس نے زبان سے کوئی لایعنی بات نکالی ہو یا بخل کیا ہو اور اس کے مواخذہ و حساب میں گرفتار ہو کر سیدھے جنت میں داخل ہونے سے روک دیا گیا ہو۔

## خوشی کی انتہا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین کو کبھی اتنا خوش ہوتے نہیں دیکھا جتنا وہ اس پر خوش ہوئے، ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ایک شخص ایک آدمی سے اس کے نیک عمل کی وجہ سے محبت کرتا ہے اگرچہ وہ خود اس جیسا عمل نہیں کرتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت رکھتا ہے۔''

(ابوداؤد)

فائدہ:

زندگی کی بنیادی قدروں میں سے ہر ایک قدر کو اتنی جامع و وسیع حقیقت حاصل ہے کہ اسے دین کا عنوان قرار دیا جاسکتا ہے اور اس کے ذریعہ سے دین کی تعبیر کی جاسکتی ہے، اس کے علاوہ فکر کی بلند ترین سطح پر ساری اقدار باہم شیر وشکر کی طرح مل کر اس طرح ایک ہوجاتے ہیں کہ ان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

محبت زندگی کی ایک اہم قدر اور ایک اہم جذبہ ہے، دین نے اسے بنیادی اہمیت دی ہے، اسلام کے بارے میں جو لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہیں یا جو کسی وجہ سے اس سے دشمنی کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک سخت گیر مذہب ہے، کاش وہ سمجھ سکتے کہ کتنی غلط بات ان کی زبان سے نکل رہی ہے، اسلام تو فی الواقع محبت کا مذہب ہے، اسلام اور اس کے عقائد ونظریات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی زندگی کے حقائق کو سمجھے، اسلام زندگی کی حقیقتوں سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، اسی لیے اسلام کو ہدایت سے تعبیر کیا گیا ہے، توحید اور آخرت کے نظریہ کو لیجیے، دونوں ہی کا زندگی کے ان حقائق سے گہرا تعلق ہے جن سے صرف نظر کرنا اندھاپن اور گمراہی ہے، مخالف اسلام نظریات کو اسی لیے ضلالت واندھیرا کہا گیا ہے کہ ان میں زندگی کی حقیقتیں نظر انداز ہوکر رہ جاتی ہیں، آخرت میں دوسری کوئی چیز نہیں، زندگی ہی کے حقائق روشن ہوں گے، جس طرح آپ آم کا درخت لگاتے ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب آپ کا لگایا ہوا یہ درخت پھل دینے لگتا ہے، پھل دینے سے پہلے بھی اس سے آپ کو شادابی اور سایہ وغیرہ حاصل ہوتا ہے، لیکن وقت آنے

پر اس کے علاوہ آپ کو میٹھے پھل بھی دینے لگتا ہے اور اس درخت کے اندر جو امکانات موجود رہے ہیں وہ ظاہر ہوجاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح اس موجودہ زندگی میں جو امکانات پائے جاتے ہیں ان سے ہم اس دنیا میں بھی فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن ایک مرحلہ ایسا آئے گا کہ زندگی کے امکانات مکمل طور پر ظاہر ہوسکیں گے اور آدمی لازوال نعمتوں سے بہرہ مند ہوگا، غرضیکہ آخرت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کائنات اور موجودہ زندگی سے مطابقت نہ رکھتی ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آخرت موجودہ زندگی کے امکانات ہی کا کامل اظہار ہے۔

محبت موجودہ زندگی کی ایک معلوم و معروف شے ہے، اس کے اثرات کا دائرہ دونوں جہاں تک وسیع ہے، مومن کی زندگی میں محبت کے جذبہ کی بڑی قدر و قیمت ہے، اللہ تعالیٰ خود اپنے نیک بندوں سے محبت فرماتا ہے، محبت کا جذبہ بڑا مستحکم اور پاکیزہ ہوتا ہے، محبت کو ساری کدورتوں اور گندگی سے دل کو پاک کرنے کی قوت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات محبوب ذات ہے، اس کی اگر کسی کو پہچان ہوجائے تو وہ لازماً اس سے محبت رکھے گا اور اطاعت و بندگی میں سرگرم نظر آئے گا، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدوجہد کرنے میں بھی وہ پیچھے نہیں رہ سکتا، اللہ سے محبت کرنے والوں کے باہمی تعلقات میں بھی محبت کارفرما ہوگی، وہ باہم ایک دوسرے کے دین وایمان اور جان و مال کے بھی محافظ ثابت ہوں گے۔

دوستی اور محبت اس دنیا کی زندگی کی بھی ایک اہم ضرورت ہے، جس کا کوئی دوست نہ ہو اس کی زندگی بے کیف و بے رنگ ہوگی، حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمہ بن اکوع کو چمڑے کی ایک ڈھال عنایت فرمائی تھی، انہوں نے اسے کسی شخص کو دے دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا سلمہ تیری ڈھال کہاں ہے؟ انہون نے عرض کیا کہ میں نے اپنے دوست کو دے دی، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تو مجھے ایسا دوست دے جو مجھے میری جان سے پیارا ہو۔ (بحوالہ مسلم)

محبت بذات خود بھی نعمت ہے، یہ بذات خود زندگی کو مطلوب ہے، محبت وہ نور ہے جس سے اللہ کی پہچان ہوتی ہے، محبت نور ہے، محبت علم ہے، نیک شخص کا حق ہے کہ ہم اس سے محبت کا تعلق رکھیں، اس کے ذریعہ سے ہمیں اس کی رفاقت حاصل ہوسکتی ہے، اس لیے کہ جذبہ محبت وہ جذبہ ہے جس کی قدر و قیمت بہرصورت باقی رہتی ہے، اگر اللہ تعالیٰ کے وفادار بندوں سے ہم سچی محت رکھتے ہیں تو کامیابی کا راز ہمارے ہاتھ میں ہے، سچی محبت کا ثبوت کبھی محض جذبہ دل ہی فراہم کردیتا ہے، کیوں کہ کثیر دولت خرچ کردینے کے بعد بھی محبت کی تحقیق نہیں ہوسکتی، اللہ تعالیٰ اصلاً ہمارے دلوں کو دیکھتا ہے۔

## دین میں اخلاق کا درجہ

حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کا ڈر رکھو، جہاں کہیں بھی ہو اور برائی کے بعد نیکی کرلو تاکہ نیکی برائی کو مٹادے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ معاملہ کرو۔''

(ترمذی، مسند احمد و دارمی)

فائدہ:

یہ ایک نہایت اہم حدیث مبارکہ ہے جو کہ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی اصلاح کے لیے فرمائی ہے، جس میں سب سے پہلے آپ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے خوف کے متعلق فرمایا۔ انسان جہاں کہیں اور جس حالت میں بھی ہو، امیر ہو یا مفلس، بااختیار ہو یا کمزور، رات کی تاریکی اور تنہائی میں ہو یا دن کی روشنی میں اور لوگوں کی نگاہوں کے سامنے، اللہ تعالیٰ کی عظمت کا پاس ولحاظ اسے ہمیشہ ہونا چاہیے، یہی چیز اسے ہر قسم کے ظلم و زیادتی یا ذلت و پستی اور ہر قسم کے گناہوں سے بھی محفوظ رکھے گی اور یہی چیز اسے اللہ تعالیٰ سے بھی قریب کرے گی، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین بندہ بن سکتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ اگر بدقسمتی سے انسان سے کوئی برائی سرزد ہو بھی ہوجائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہ مایوس نہ ہو فوراً اس گناہ کی تلافی کی فکر کرے، اس کی بہترین شکل بھی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادی وہ یہ کہ توبہ و استغفار کے ساتھ ساتھ کوئی ایسا نیک عمل بھی کرے جس سے اس گناہ اور برائی کے برے اثرات اس کے دل و دماغ سے زائل ہوجائیں اور اس کی زندگی گناہ کی آلودگیوں سے پاک ہوجائے، یہ چیز اللہ

تعالیٰ کی رحمت کو اس کی طرف متوجہ کرنے میں بے حد موثر ثابت ہوگی۔

پھر جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ خاص حق ہے کہ بندہ ہر مقام پر اور ہمیشہ اپنے اللہ کو یاد رکھے اور اس کی طرف سے غافل نہ ہو، اسی طرح بندگان خدا کا بھی اس پر یہ حق ہے کہ ان کے ساتھ اس کا جو معاملہ بھی ہو اس میں وہ حسن اخلاق کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھے مخلوق خدا کا ہم پر حق بھی ہے اور ہمارے لیے اس کی کسوٹی بھی ہے کہ ہم کس طرح کے آدمی ہیں، خود غرض، مغرور اور پست قسم کے یا عالی ظرف، بلند اور باکردار۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں ایمان کے بعد جن چیزوں پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور انسان کی سعادت کو ان پر موقوف بتلایا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی اخلاق حسنہ اختیار کرے اور برے اخلاق سے اپنی حفاظت کا انتظام کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے جن مقاصد کا قرآن پاک میں ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانوں کا تزکیہ کرنا ہے وَ یُزَکِّیۡھِمۡ اور اس تزکیہ میں اخلاق کی اصلاح اور درستی کی خاص اہمیت ہے۔

ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اخلاقی خوبیوں اور اچھے کاموں کی تکمیل کے لیے بھیجا ہے۔ (بحوالہ شرح السنہ)

اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے کہ میری بعثت کی اصل غرض و غایت اخلاق و اعمال کے مکارم و محاسن کی تکمیل ہے، اخلاق درحقیقت فطری جذبات و احساسات ہی کا دوسرا نام ہے، جس کا اظہار انسان کے مختلف اعمال و افعال کے ذریعے سے ہوتا رہتا ہے، ارادہ و اختیار اور جذبات و احساسات کے صحیح اور بہترین استعمال سے اس کی زندگی کی نمود ہوتی ہے جس کو ہم مثالی اور پسندیدہ زندگی کہتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل کارنامہ یہی ہے کہ آپ نے انسانی زندگی کو مختلف اکائیوں میں تقسیم کرنے کی بجائے اسے ایک کل قرار دیا اور زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق خواہ اس کا تعلق معاشرت و معیشت سے ہو یا حکومت و سیاست سے، اخلاق کے صحیح اصول و ضوابط بیان فرمائے، اور انہیں زندگی میں عملاً کر دکھایا اور ان ہی اصولوں پر سوسائٹی اور ریاست کا نظام قائم فرمایا۔

انسان کی زندگی اور اس کے نتائج میں اخلاق کی بڑی اہمیت ہے، اگر انسان کے اخلاق اچھے ہوں تو اس کی اپنی زندگی بھی قلبی سکون اور خوش گواری کے ساتھ گذرے گی اور دوسروں کے لیے بھی اس کا وجود رحمت اور چین و سکون کا ضامن ہوگا، اور اس کے برعکس اگر انسان کے اخلاق برے ہوں تو خود بھی وہ زندگی کے لطف و سرور سے محروم رہے گا اور جن سے اس کا واسطہ اور تعلق ہوگا ان کی زندگیاں بھی بے مزہ اور تلخ ہوں گی، یہ تو خوش اخلاقی اور بد اخلاقی کے وہ نقد دنیاوی نتائج ہیں جن کا ہم اور آپ روزمرہ مشاہدہ اور تجربہ کرتے رہتے ہیں لیکن مرنے کے بعد والی ابدی زندگی میں ان دونوں کے نتیجے ان سے بدرجہا زیادہ اہم نکلنے والے ہیں، آخرت میں خوش اخلاقی کا نتیجہ ارحم الراحمین کی رضا اور جنت ہے اور بد اخلاقی کا انجام خداوند قہار کا غضب اور دوزخ کی آگ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر امتی کو اس سے محفوظ فرمائے۔ آمین

## خوف خدا

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت وَالَّذِیۡنَ یُؤۡتُوۡنَ مَاۤ اٰتَوۡا وَّ قُلُوۡبُھُمۡ وَجِلَۃٌ (اور جو لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل کپکپاتے ہیں) کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے اور چوری کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے صدیق کی بیٹی! نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزہ رکھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور صدقہ کرتے ہیں اور اس کے باوجود ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی یہ نیکیاں قبول نہ ہوں، یہی وہ لوگ ہیں جو بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں۔“

(ترمذی و ابن ماجہ)

فائدہ:

قرآن پاک کا وہ ٹکڑا جو اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے وہ سورۃ المومنون کی ایک آیت کا جزو ہے، پوری آیت اور اگلی آیت یہ ہے۔

﴿اور جو لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل کپکپاتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی ہیں جو جلدی جلدی بھلائیاں

حاصل کررہے ہیں اور یہی ہیں جو ان کی طرف دوڑ کر جانے والے ہیں۔﴾ (المومنون ۶۰-۶۱)
یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں کہ کہیں کسی کوتاہی کی وجہ سے ہمارا عمل یا صدقہ قبول نہ ہو،اس آیت میں دینے سے مراد مادی چیزوں کا دینا ہی نہیں ہے بلکہ عربی زبان میں دینے (ایتاء) کا لفظ غیر مادی اور باطن سے تعلق رکھنے والی چیزوں کے دینے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے،اس طرح اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں اور جو نیکی اور عبادت بھی کرتے ہیں اس حال میں کرتے ہیں کہ ان کے دل لرزاں رہتے ہیں کہ معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ نیکیاں یہ شرف قبولیت حاصل کرسکتی ہیں یا نہیں۔
حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا کو خیال ہوا کہ ان کے لرزاں وترساں ہونے کہ وجہ شاید یہ ہو کہ وہ برے کاموں میں ملوث ہوں،مثلاً شراب پیتے ہوں یا چوری کرتے ہوں،اگر وہ نیک عمل کرتے ہوتے تو ان کے ڈرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی،اس پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:نہیں،اس آیت میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ لوگ کسی بدعملی کا شکار ہرگز نہیں ہیں،بلکہ اس آیت میں تذکرہ ان مومنوں کا ہے جو اچھے اعمال کرتے ہیں،وہ اپنے مقدور بھر اعمال کرنے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں کہ معلوم نہیں ہمارے اعمال اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں قابل قبول ٹھہریں گے بھی یا نہیں،کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اعمال ہمارے رب کے ہاں ہماری مغفرت کے لیے کافی ثابت نہ ہوں اور کہیں یہ نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کچھ قصور نکل آئے اور یہ نیکیاں رد کردی جائیں،ڈرنے کی اصل وجہ گناہ کے کام نہیں بلکہ ان کی شریف النفسی اور وہ احساس ہے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے حقوق کی اہمیت کے بارے میں وہ اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:دراصل ایسے ہی لوگ ہیں جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ بھلائیوں کے لیے تیزی دکھاتے ہیں،اس سے معلوم ہوا کہ یہ کیفیت دین میں مطلوب ہے کہ آدمی کسی حال میں بھی بے خوف اور مطمئن ہوکر نہ بیٹھ رہے،اسے اللہ تعالیٰ سے اچھی امید بھی ہو مگر وہ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی سے ہر وقت لرزاں وترساں بھی رہے،اسے ہی لوگ دین کی راہ میں آگے بڑھتے رہتے ہیں،نہ وہ کسی جمود کا شکار ہوتے ہیں نہ انہیں تعطل کی بیماری لگتی ہے،زیادہ سے زیادہ کام کرنیکے بعد بھی وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ابھی کچھ نہیں کرسکے ہیں،ابھی تو بہت سے کام ہیں جو کرنے کو باقی ہیں۔
نیوٹن نے اس وقت جب کہ سائنس کی دنیا میں اس کی دریافتوں کی شہرت تھی کہا تھا ہم جو کچھ معلوم کرسکے ہیں وہ اس کے مقابلہ میں بہت کم ہے جن رموز سے ہم ابھی ناواقف ہیں،ہماری حالت اس شخص کی ہے جس کے ہاتھ میں سمندر کی چند گھونگھیاں آگئی ہیں جبکہ سمندر میں ابھی بے شمار بیش قیمت موتی موجود ہیں،نیوٹن کو اس کا احساس ہوگیا تھا کہ فطرت کے جو قوانین اس نے دریافت کیے ہیں وہ ان قوانین کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہیں جو ابھی انسان کے لیے سربستہ راز کی حیثیت رکھتے ہیں،اسی طرح جب مومن کو اس کا احساس ہوجاتا ہے کہ اس کے ذمہ کتنے کام ہیں جو وہ کرسکتا تھا مگر وہ یوں ہی پڑے ہیں اور جو کام اس نے کیے ہیں معلوم نہیں ان میں کتنی خامیاں موجود ہیں تو اس حالت میں اس کے دل کا وہی حال ہوتا ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔

## دفاعی حکمت عملی

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:''اللہ کی راہ میں ایک دن کا رباط (یعنی اسلامی سرحدوں کی حفاظت کا کام) ساری دنیا اور جو کچھ اس دنیا میں ہے ان سب سے بہتر ہے۔''

(بخاری ومسلم)

فائدہ:

اسلامی لشکر کا پوری طرح مسلح ہوکر خطرے کی جگھوں اور سرحدوں پر،جہاں امکان ہے کہ دشمن اندر آسکتا ہے یا مسلمانوں کی آبادی پر حملہ آور ہوسکتا ہے،ٹھہرنا رباط کہلاتا ہے۔جہاد کی طرح یہ بھی فرض کفایہ ہے،یعنی جب بعض افراد یہ فریضہ سرانجام دے رہے ہوں تو باقی لوگوں سے ختم ہوجاتا ہے،اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے مقابلہ میں اس کا حکم یوں دیا ہے۔

﴿اے ایمان والو! صبر کرو، ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو اور (دشمن کے مقابلہ میں) جمے رہو اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔﴾ (آل عمران ۲۰۰)

دشمن کے مقابلہ میں ڈٹ جانا یہ صبر کی سخت ترین صورت ہے، یہ بڑے عزم و حوصلہ کا کام ہے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق حاصل کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے، جیسا کہ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ ہر مرنے والے کا عمل ختم ہو جاتا ہے، البتہ (جنگ میں دشمن کی) نگرانی کرنے والے کا عمل قیامت تک بڑھتا رہے گا اور وہ قبر مین منکر نکیر کی آزمائش سے محفوظ رہے گا۔ (بحوالہ ابوداؤد و ترمذی)

آج عالم اسلام جن خطرات اور حالات سے دوچار ہے ان سے ہر شخص پوری طرح باخبر ہے، اسلام دشمن طاقتیں جو مادی ساز و سامان، جدید آلات حرب اور جدید ٹیکنالوجی سے پوری طرح لیس ہیں، عالم اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹادینے کا تہیہ کیے بیٹھی ہیں، اور تمام مسلمان اب بھی اپنی مذہبی بقا کی جنگ کے لیے ایک نہیں، کئی محاذوں پر طاغوت کا سامنا کر رہے ہیں، جدید وسائل و آلات کی کمی ہماری سب سے بڑی کمزوری بن چکی ہے، علم و حکمت سے فرار ہماری بقا کے لیے خطرہ بن چکا ہے، ہمارا معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ نہیں رہا ہے۔

آج مسلمانوں کی داخلی صفیں اخلاق و کردار کے اعتبار سے ٹوٹ چکی ہیں، ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم خائن ہو چکے ہیں، بدعہدی ہماری سرشت بن چکی ہے، ہمارے فیصلے ذاتی اور گروہی مفادات کے اسیر ہو چکے ہیں، ہم عرب و عجم میں بٹ چکے ہیں، ہم عدل و انصاف کی اہمیت اور حقیقت سے بے خبر ہو گئے ہیں، ہمیں دوست و دشمن کی تمیز نہیں رہی ہے، ہم مسلمانوں کے قتل عام پر اس کو دوسرے ملک کا داخلی مسئلہ کہہ کر اپنی جان چھڑانے لگے ہیں، کافروں کے ساتھ اتحاد و اتفاق، اور ان کے اشاروں پر اپنے ہی مسلمان بھائیوں کا ناحق خون بہانا، اور ان ناحق فیصلوں نے ہمیں باہمی خوں ریزی میں الجھا کر ہمارا سب کچھ ہم سے چھین لیا ہے، اب ہمارے پاس کیا رہ گیا ہے کہ ہم محاذ جنگ پر پامردی کے ساتھ اپنے دشمنوں سے جنگ کریں؟ یاد رکھیے دفاع و بقا کی جنگ صرف فوج اور قوم نہیں لڑتی بلکہ اس کی قوت کردار لڑتی ہے، ہمارا کردار ایمان و عمل صالح سے عبارت ہے، اگر یہ بات صحیح ہے اور اس کے غلط ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے تو پھر یہ بھی صحیح ہے کہ۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

ہمیں جو دفاعی حکمت عملی اسلام نے بتائی ہے، اس میں حقیقی اہمیت ہمارے ایمان و عمل صالح ہی کی ہے، اسی لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔﴾ (آل عمران ۱۳۹)

لیکن ساتھ ساتھ اسباب و آلات اور ہمہ اقسام کے جنگی ہتھیار مہیا کرنا بھی جہاد کی طرح فرض ہے، اس لیے کہ ان کے بغیر جہاد نہیں ہو سکتا، ارشاد ربانی ہے۔

﴿اور جہاں تک ہو سکے ان کے (مقابلے کے) لیے طاقت تیار کرو اور گھوڑے بھی تیار رکھو اس سے تم اللہ کے اور اپنے دشمن کو ڈرا سکو گے۔﴾ (الانفال ۶۰)

لہذا آج کل کے حالات کے مطابق میزائیل، ٹینک، بم، آبدوزیں اور جنگی جہاز وغیرہ کی تیاری نہایت ضروری ہے، تمام مسلمانوں پر خواہ جو ایک حکومت قائم کر چکے ہیں یا مختلف حکومتوں کی صورت میں رہ رہے ہیں لازم ہے کہ ہتھیار تیار رکھیں اور جنگی سامان مہیا کریں اور معاشرے کے اہل افراد کو جنگ و قتال کی تربیت دیں، جس سے وہ نہ صرف دشمن کے حملے کو روک سکیں، بلکہ اللہ کے دین کی عظمت اور عدل و خیر اور زمین اور امن و سلامتی کے لیے اللہ کے راستہ میں آگے بڑھ کر بھی حملہ کرنا پڑے تو کر سکیں۔

مسلمانوں پر یہ بھی لازم ہے کہ فوجی ٹریننگ کا جبری انتظام کریں، جو نوجوان اٹھارہ سال کی عمر کے ہو جائیں ان کو لازمی فوجی تربیت کے لیے طلب کیا جائے، اور انہیں جنگ و قتال کے فنون کی تربیت دی جائے اور پھر ان کا نام مسلمان فوج میں رجسٹر کر لیا جائے، اس طرح جس وقت ضرورت پڑے گی وہ جہاد کے لیے تیار ہوگا، اگر اس کی نیت درست ہے تو اس رجسٹریشن کی وجہ سے ہی یہ ''مرابط فی سبیل اللہ'' کے مرتبہ میں ہے۔ یہ بھی مسلمانوں پر لازم ہے کہ جنگی سامان تیار کرنے والی فیکٹریاں لگائیں اور دنیا میں جس انداز کا سامان جنگ تیار ہو رہا ہے یا ہو سکتا ہے خود تیار کریں، چاہے اس کے لیے انہیں

غیر ضروری خورد ونوش ،لباس ،سواری اور رہائش کے اخراجات ترک کرنا پڑیں، یہ ایک ایسی ذمہ داری ہے جس سے فریضہ جہاد مکمل اور بہترین طریقہ سے سرانجام دیا جاسکتا ہے، ورنہ وہ مجرم ہوں گے اور دنیا وآخرت میں اللہ کے عذاب سے دوچار ہوں گے۔

## خدا کا خوف اور فکر آخرت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''قسم اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر (اللہ کے قہر وجلال اور قیامت و آخرت کے لرزہ خیز ہولناک احوال کے متعلق) تمہیں وہ سب معلوم ہوجائے ، جو مجھے معلوم ہے تو تمہارا ہنسنا بہت کم ہوجائے اور رونا بہت بڑھ جائے۔''

(بخاری)

فائدہ:

ایمان کے بعد انسان کی زندگی سنوارنے اور فلاح کے مقام تک اس کو پہنچانے میں چونکہ سب سے بڑا دخل اللہ تعالیٰ کے خوف وخشیت اور آخرت کی فکر کو ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت میں ان دو چیزوں کے پیدا کرنے کی خاص کوشش فرمائی ہے، کبھی اس خوف وفکر کے فوائد اور فضائل بیان فرماتے اور کبھی اللہ تعالیٰ کے قہر وجلال اور آخرت کے ان سخت احوال کو یاد دلاتے ، جن کی یاد سے دلوں میں یہ دونوں کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس کا خاص ،موضوع گویا یہی تھا اور صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور آخرت اور دوزخ وجنت کے متعلق آپ کے ارشادات سنتے تھے، تو ان کا حال یہ ہوجاتا تھا کہ دوزخ وجنت گویا ان کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔

اس حدیث پاک میں آپ کے ارشاد مبارک کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی اور اس کے قہر وجلال اور قیامت و آخرت کے ہولناک لرزہ خیز احوال کے متعلق جو کچھ مجھے معلوم ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مجھ پر منکشف کردیا ہے اگر تم کو بھی اس کا پورا علم ہوجائے اور تمہاری آنکھوں کو بھی وہ سب نظر آنے لگے جو میں دیکھتا ہوں اور تمہارے کان بھی وہ سب کچھ سننے لگیں جو میں سنتا ہوں تو تمہارا آرام وسکون ختم ہوجائے ،تم بہت کم ہنسو اور بہت زیادہ روؤ۔

ایک اور روایت میں اس طرح آتا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے نبی! آدمیوں میں سب سے بڑھ کر ہوشیار اور دوراندیش کون ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا وہ جو موت کو زیادہ یاد کرتا ہے اور موت کے لیے زیادہ تیاری کرتا ہے، جو لوگ ایسے ہیں وہی دانش منداور ہوشیار ہیں، انہوں نے دنیا کی عزت بھی حاصل کی اور آخرت کا اعزاز واکرام بھی۔ (بحوالہ طبرانی فی المعجم الصغیر)

یعنی جب یہ حقیقت ہے کہ اصل زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے، جس کے لیے کبھی فنا نہیں، تو اس میں کیا شبہ کہ دانش منداور دوراندیش اللہ تعالیٰ کے وہی بندے ہیں جو ہمیشہ موت کو پیش نظر رکھ کر اس کی تیاری کرتے رہتے ہیں اور اس کے برعکس وہ لوگ بڑے ناعاقبت اندیش اور احمق ہیں جنہیں اپنے مرنے کا تو پورا یقین ہے لیکن وہ اس سے اور اس کی تیاریوں سے غافل رہ کر دنیا کی لذتوں میں مصروف اور منہمک رہتے ہیں۔ دنیا میں عزت کا مقام بھی ایسے ہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو دنیا پرست نہیں بلکہ آخرت کے طالب ہوتے ہیں اور آخرت کا اعزاز واکرام تو صرف انہی کے لیے مخصوص ہے، دنیا پرستوں کے لیے آخرت میں ذلت ورسوائی کے سوا اور کچھ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور ایک نہ ختم ہونے والی منزل جہاں پر پہنچنے سے پہلے ہر ایک کو وہاں جانے کی تیاری کرنی ہے اور پہنچنے کے بعد واپسی نہیں ہے، یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے تو پھر کامیاب وہی لوگ ہیں جو مرنیکے بعد والی زندگی کو یاد رکھتے ہیں اور اس کی تیاری کرتے ہیں، اس شخص سے زیادہ بے وقوف اور کون ہوگا جس کو اپنے مرنے کا بھی علم ہے اور انجام کا بھی علم ہے مگر اس کی تیاری نہیں کرتا اور اپنے قیمتی اثاثے کو ضائع کردیتا ہے دنیا میں کوئی آدمی ایسا نہیں جس کو اس بات کا علم ہو کہ اگر اس نے کام میں اپنا سرمایہ لگایا تو وہ ضائع ہوجائے گا اور پھر وہ رقم اسی میں لگائے ایسا کوئی نہیں ہے، مگر دین اور آخرت کی خاطر آج یہ سوچ بالکل ختم ہوگئی ہے۔

اللہ رب العزت توفیق عمل نصیب فرمائے۔

## اسلامی لباس

حضرت ابوالاحوص نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور (اس وقت) میرے کپڑے میلے کچیلے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہارے پاس مال ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے پاس کس قسم کا مال ہے؟ تو میں نے عرض کیا اللہ تعالیٰ نے مجھے بکریاں، گھوڑے اور غلام سب کچھ دے رکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب تمہیں مال دیا ہے تو اس کے انعامات کا اثر اور اس کی عزت تمہارے جسم پر بھی نظر آنی چاہئے۔

(ابوداؤد)

فائدہ:

ایک انسان کو زندگی گزرانے کے لیے جن باتوں کی ضرورت پیش آتی ہے دین اسلام ان تمام موقعوں کے لیے مکمل تعلیمات پیش کرتا ہے۔ لباس بھی انسانی زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے چنانچہ اس سلسلے میں بھی اسلام بھرپور رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے لباس کے بنیادی مقاصد بتادیئے ہیں۔ فرمان الہی ہے:

﴿اے بنی آدم، ہم نے تمہارے لیے ایسا لباس اتارا جو تمہاری شرم گاہوں کو بھی چھپاتا ہے اور تمہارے لیے زینت کا سبب بھی ہے اور تقوی کا لباس تمہارے لیے سب سے بہتر ہے۔﴾ (اعراف ۲۶)

دین فطرت دین اسلام نے کوئی مخصوص لباس مقرر نہیں کیا کہ ہر مسلمان کے لیے لازمی ہو کہ بس یہی لباس پہننا ضروری ہے اور ایسا ممکن بھی نہیں کہ موسموں اور معاشرتی حالات کے اختلاف کے سبب ایک ہی لباس ہر جگہ کے لیے مناسب بھی نہیں ہوسکتا۔ البتہ بنیادی اصول ضرور بتادیئے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت پاک میں اللہ جل جلالہ نے لباس کے دو بنیادی مقاصد بیان کئے ہیں۔ لباس کا پہلا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ شریعت کے مقرر کئے ہوئے ستر (مرد کے لیے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ اور عورت کے لیے ہاتھ اور پیروں کے علاوہ پورا جسم) کے حصوں کو چھپالے جس کا مطلب یہ ہے نہ لباس اتنا چھوٹا ہو کہ ستر کھلا رہ جائے، نہ اتنا باریک ہو کہ ستر اس سے جھلکے اور نہ اس قدر چست ہو کہ جسم کی بناوٹ اس سے ظاہر ہو۔ جو لباس ان شرطوں کو پورا نہ کرے شریعت کی نگاہ میں وہ سرے سے لباس ہی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اس مقصد کو پورا نہیں کر رہا جس کے لیے وہ بنایا گیا ہے۔

لباس کا دوسرا مقصد زیب وزینت اور خوبصورتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لباس بے ڈھب اور بے ڈھنگا نہیں ہونا چاہئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اچھا اور خوبصورت لباس جس سے انسان کو خوشی حاصل ہو پہننا جائز ہے اور یہ فضول خرچی میں داخل نہیں ہے بشرطیکہ اس کا مقصد تکبر، نمائش اور بڑائی نہ ہو۔ بلکہ صاحب حیثیت کا گھٹیا لباس پہننا پسندیدہ بات نہیں جیسا کہ مندرجہ بالا حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صاحب مالدار ہونے کے باوجود اپنی حیثیت سے کم درجے کا لباس پہنے ہوئے تھے۔

اسی طرح دین کی ایک اصولی تعلیم یہ بھی ہے کہ مسلمان دوسری قوموں کی نقالی سے بچیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ مشرکین کے طریقوں کی مخالفت کرو۔ (بحوالہ بخاری) اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے کہ جو شخص کسی قوم کی نقالی کرے گا وہ انہی میں سے ہے۔ (بحوالہ ابوداؤد)

لہذا لباس کے معاملے میں بھی اس اصول کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ البتہ ضرورت کے تحت جب کہ نیت اور ارادہ نقل کا نہ ہو اور دین کی بنیادی تعلیمات کی روگردانی نہ ہو رہی ہو تو اس میں گنجائش ہے۔ لیکن غیرت قومی کا تقاضا تو یہی ہے کہ انسان جس قدر اس تشبہ سے بچ سکتا ہے بچنے کی کوشش کرے۔ اس لیے کہ: خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

## تقویٰ اور رزق

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ’’مجھے یک ایسی آیت معلوم ہے اگر لوگ اسے

اختیار کرلیں تو وہی ان کے لیے کافی ہے،آیت ہے: وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَہٗ مَخْرَجًاOوَیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَایَحْتَسِبُ(اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا اس کے لیے وہ نجات کی راہ پیدا کردے گا اور اسے وہاں سے روزی دے گا جس کا اسے گمان بھی نہ ہوگا)۔''

(مسند احمد،ابن ماجہ و دارمی)

فائدہ:

یہ سورۃ الطلاق کی مشہور و معروف آیت ہے، یہ آیت بتاتی ہے کہ تقویٰ کوئی معمولی وصف نہیں ہے،تقویٰ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بزرگی کو تسلیم کرتا اور اپنی مرضی کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کو فوقیت دیتا ہے،اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا حصول ہی اس کی اپنی زندگی کا اصل مقصود ہے،ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اسے بے چارگی کی حالت میں نہیں رہنے دے گا،وہ اس کے لیے لازماً پریشانیوں اور تکلیفوں سے نجات کی راہ نکالے گا، یہ بھی ناقابل قیاس ہے کہ ایسا شخص رزق سے محروم رہ جائے،اللہ تعالیٰ اس کے لیے رزق کا سامان ایسے طریقہ سے کرسکتا ہے کہ اسے پہلے سے اس کا کوئی گمان بھی نہ رہا ہو،اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت حاصل ہے،اس پر بھروسہ کرکے کوئی شخص کبھی مایوس نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالیٰ، یوم آخرت اور سلسلہ نبوت پر ایمان کے بعد جن چیزوں کی دعوت قرآن مجید نے زیادہ اہمیت کے ساتھ دی ہے اور جن لوگوں کو گویا انسان کی فلاح وسعادت کا مدار بتایا ہے ان میں سے ایک تقویٰ بھی ہے۔لفظ تقویٰ کے اصلی اور لغوی معنیٰ بچنے کے ہیں،شرعی اصطلاح میں گناہوں سے بچنے کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے،اور جب یہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے تو اس کا مطلب اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا کردیا جاتا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت سے بچے اور ڈرے،تقویٰ کی اصل حقیقت یہ ہے کہ بندہ اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہوئے پھر اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اس کی پکڑ اور آخرت کے عذاب اور مواخذے سے ڈرتے ہوئے فکر اور احتیاط کے ساتھ زندگی گزارے۔

اس آیت میں تقویٰ کی دو برکتیں بیان فرمائی گئی ہیں،اول یہ کہ تقویٰ اختیار کرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ بچنے کا راستہ نکال دیتے ہیں، بچنے سے مراد ہے دنیا کی سب مشکلات ومصائب سے بچنا اور آخرت کی سب مشکلات ومصائب سے بھی،اس طرح آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ متقی یعنی گناہوں سے بچنے والے آدمی کے لیے دنیا وآخرت کی ہر مشکل ومصیبت سے نجات کا راستہ نکال دیتے ہیں،اور دوسری برکت یہ ہے کہ اس کو ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتے ہیں جہاں اس کو خیال وگمان بھی نہیں ہوتا۔رزق سے بھی اس جگہ مراد ہر ضرورت کی چیز ہے خواہ دنیا کی ہو یا آخرت کی،مومن متقی کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ اس آیت میں یہ ہے کہ اس کی ہر مشکل کو بھی آسان کردیتا ہے اور اس کی ضروریات کا بھی ذمہ لیتا ہے اور ایسے راستوں سے اس کی ضروریات پوری فرماتا ہے جس کا اس کو وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔

اللہ اکبر! تقویٰ کی خیر و برکات کتنی عظیم اور قیمتی ہیں،حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:غموں اور دکھوں سے نجات کا نسخہ بتلانے والی قرآن کریم کی یہ سب سے عظیم آیت کریمہ ہے۔

تقویٰ کے حصول رزق کا سبب ہونے کی دلیل قرآن پاک کی یہ آیت بھی ہے۔

﴿اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے (اور برے کاموں کفر اور شرک سے) بچے رہتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے ،مگر انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کے کاموں کی سزا میں ان کو دھر پکڑا۔﴾ (الاعراف۔۹۶)۔

## دعوت کے آداب

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''جب تم میں سے کسی کی دعوت کی جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرلے اب اگر وہ شخص (جس کی دعوت کی جارہی ہے) روزے سے ہے تو اس (میزبان) کے حق میں دعا کردے اور اگر روزے سے نہیں ہے تو اس کے ساتھ کھانا کھالے۔''

(ترمذی)

فائدہ:

اسلام مسلمانوں کے درمیان آپس کے گہرے تعلق پر بہت زور دیتا ہے۔اس کی تعلیمات میں یہ بھی ہے کہ مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں کہ جسم کے ایک حصے کی راحت وتکلیف پورے بدن کی راحت وتکلیف ہے۔لیکن بات صرف تعلیم ہی کی حد تک نہیں بلکہ اس کو حاصل کرنے کی عملی تدابیر بھی ساتھ ہی ساتھ موجود ہیں۔چنانچہ ایک دوسرے کو کھانے کی دعوت دینا بھی اسی تعلق کے حصول اور اس کو مضبوط کرنے کا ذریعہ ہے۔

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جب تمہیں دعوت دی جائے تو اس کو قبول کرلو۔ دعوت قبول کرنا مسلمان کا حق ہے۔ایک اور حدیث میں ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق بتائے گئے ہیں جن میں سے ایک دعوت کا قبول کرنا بھی ہے۔لہذا دعوت قبول کرنا سنت عمل ہے۔دعوت اس نیت سے قبول کی جائے کہ اس سے میرے مسلمان بھائی کو خوشی ہوگی یا پھر اس نیت سے کہ اپنے مسلمان بھائی سے ملاقات کے لیے جارہا ہوں اس صورت میں وہ ان لوگوں میں سے ہوجائے گا جو آپس میں صرف اللہ کے واسطے سے محبت رکھتے ہیں۔دعوت قبول کرنے میں یہ نہ دیکھا جائے کہ بلانے والا امیر ہے یا غریب۔البتہ دعوت قبول کرنا اس وقت سنت ہے جس کے نتیجے میں آدمی کسی گناہ میں مبتلا نہ ہو مثلاً ایسی دعوت نہیں قبول کرنی چاہیے جہاں مردوں اور عورتوں کا مخلوط اجتماع ہو۔

مسلمان بھائی کو کھانا کھلانے کے بڑے فضائل ہیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ہے کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جو کھانا کھلائے (بحوالہ احمد)۔اسی طرح فرمایا کہ جنت میں ایسے صاف دریچے ہیں کہ ان کے باہر سے اندر کی چیز اور اندر سے باہر کی چیز نظر آتی ہے اور وہ ان لوگوں کے لیے ہیں کہ گفتگو نرم کریں، کھانا کھلائیں اور رات کو نماز پڑھیں جس وقت لوگ سوتے ہوں (بحوالہ ترمذی)۔اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اپنے بھائی کو اتنا کھلا دے کہ اس کا پیٹ بھر جائے اور پانی پلا دے کہ اس کی پیاس جاتی رہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ سے سات خندقیں دور کردے گا جن میں سے دو خندقوں کے درمیان پانچ سو سال کی راہ ہوگی (طبرانی)

ان فضائل کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ اسی وقت حاصل ہوں گے جب دعوت کا مقصد اللہ اور اس کے رسول کے اتباع ہو اگر نیت یہ ہو کہ رسم نبھانی ہے تو یہ دعوت نہ ہوئی رسم ہوئی جس پر کسی اجر کا امید بے کار ہے۔

دعوت کے سلسلے میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس کا مقصد دونوں طرف سے اظہار محبت ہے جو ضروری نہیں کہ پلاؤ، قورمے، اور پرتعیش کھانے کے ذریعے ہی ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص بکری کے پائے کی بھی دعوت کرے گا تو میں قبول کرلوں گا (بحوالہ بخاری)۔ حضرت علیؓ سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے کی کسی شخص نے آپ کی دعوت کی۔آپؓ نے فرمایا کہ میں تین شرطوں پر تیری دعوت قبول کرتا ہوں۔ایک یہ کہ بازار سے میرے لیے کچھ نہ لانا، دوسرے یہ کہ جو کچھ گھر میں ہو اسے پیش کردینا، تیسرا یہ کہ ایسا مت کرنا کہ اپنے گھر والوں کے لیے کچھ نہ چھوڑے۔حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کیا ہے کہ مہمان کے لیے ایسی چیز کا تکلف نہ کریں جو ہمارے پاس نہ ہو اور جو چیز موجود ہو وہ اس کے سامنے رکھ دیں۔

مندرجہ بالا حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی دعوت کی گئی ہے اگر وہ روزے سے ہے تو وہ میزبان کے حق میں دعا کردے۔بعض علمائے کرام کی رائے میں اگر روزہ نفلی ہے تو مسلمان بھائی کی دعوت قبول کرنے کے لیے اور اس کا دل خوش کرنے کے لیے نفلی روزے توڑ دے تو اس کی بھی اجازت ہے۔البتہ بعد میں اس روزے کی قضا کرلے۔

## مسلمان کو تکلیف دینا

حضرت مستورد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص کسی مسلمان کے ذریعے ایک نوالہ کھالے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو دوزخ سے اسی قدر نوالہ کھلائے گا اور جو شخص کسی مسلمان کا عیب ذکر کرکے ایک کپڑا پہنے گا تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو دوزخ سے اسی قدر کپڑا پہنائے گا اور جو شخص کسی شخص کو یا کسی کی وجہ سے ریاکاری اور تشہیر کے مقام پر پہنچائے گا تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو قیامت کے روز ایسے مقام پر کھڑا

کرے گا کہ جہاں پر اس کی اچھی طرح بدنامی ہو۔''

(ابوداؤد)

فائدہ:

کہیں پڑھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کے دور خلافت میں ایک شخص دور دراز کے کسی علاقے سے سفر کر کے مدینہ منورہ پہنچا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے دریافت کیا کہ تو اتنی لمبی مسافت طے کر کے آیا ہے یہ بتا کہ مسلمانوں کو کیسا پایا؟ اس شخص نے جواب دیا جیسے ایک ماں کے بیٹے! یہ ہے اسلام کی قوت اور اثر کہ ایک اجنبی شخص بھی جان لیتا ہے کہ یہ قوم کسی ان دیکھے بندھن میں بندھی ہوئی ہے جس نے انہیں بھائیوں کی طرح یک جان کر دیا ہے۔

ایک نومسلم نے اپنے اسلام لانے کو جو اسباب گنوائے ہیں ان میں ایک مصر کے شہر قاہرہ کے ایک بازار کا واقعہ بھی ہے جہاں اس نے دیکھا کہ ایک سبزی فروش کسی ضرورت سے اٹھ کر گیا اور ساتھ والے سبزی فروش کو اپنی دکان کا خیال رکھنے کا کہہ گیا۔ اتفاق سے ایک شخص سبزی خریدنے خالی دکان پر آ کھڑا ہوا۔ ساتھ والا سبزی فروش اپنی دکان سے اٹھ کر خالی دکان پر آیا خریدار سے اسی طرح معاملہ کیا گویا کہ اپنی دکان پر ہے اس کو سودا دیا اس سے پیسے لے کر اسی دکان میں رکھے اور دوبارہ اپنی دکان پر لوٹ آیا۔ ان نومسلم نے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اس دکاندار سے دریافت کیا کہ تم نے اس گاہک کو اپنی دکان پر کیوں نہ بلالیا؟ جواب ملا وہ تو اس کا گاہک تھا میں اپنی دکان پر کیسے بلالیتا ہے! وللہ الحمد۔ یہ وہ کردار تھا جو آج کے مسلمان کے وہم وگمان سے بالا ہے جو اپنے مفاد اپنی ذات اپنے نفع اور اپنی دنیا کے چکر میں سب کچھ بھول چکا ہے۔ وہ یہ بھول چکا کہ نیکی یا بدی اپنے مقام پر نہیں رکتی۔ جو کچھ ہم دوسرے کے لیے چاہتے ہیں وہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے آج نہیں تو کل۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کی حق تلفی کر کے، اس کی کسی کمزوری یا ضرورت سے فائدہ اٹھا کر یا کسی مسلمان کو تکلیف دے کر اپنا کوئی مفاد حاصل کر لے تو درحقیقت اس نے جہنم کا لقمہ کھایا۔ اس میں رشوت لینے والے بھی شامل ہیں، دھوکہ اور فریب سے روپیہ بٹور لینے والے بھی شامل ہیں، ذخیرہ اندوزی کرنے والے بھی شامل ہیں، ملاوٹ کرنے والے بھی شامل ہیں، ختم المیعاد دوائیں فروخت کرنے والے قاتل بھی شامل ہیں، ناقص تعمیرات کرنے والے بھی شامل ہیں۔

اسی طرح اگر کسی مسلمان کو بدنام کر کے مال حاصل کر لیا، الیکشن جیت لیا، کوئی انعام حاصل کر لیا تو وہ بھی جہنم کے لباس کا حقدار ہے۔ آگ اور انگاروں میں جلنے کے قابل ہے۔ اس میں وہ اخبار والے شامل ہیں جو جھوٹی خبروں کے ذریعے لوگوں کی عزت سے کھیلتے ہیں تاکہ اپنے اخبار کی اشاعت بڑھائیں۔ اسی طرح جو شخص مسلمان کو تکلیف پہنچا کر شہرت حاصل کرے گا، اس کی برائی بیان کر کے اپنی اچھائی ثابت کرے گا تو روز قیامت اس کو بدترین عذاب ہوگا اور تمام لوگوں میں اس کی شہرت ہوگی۔

ایک حدیث شریف میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر مسلمان پر مسلمان کا مال، اس کی عزت وآبرو اور اس کا خون حرام ہے اور انسان میں اس قدر برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو کمتر سمجھے۔ (ابوداؤد)

ایک فرمان رسول ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے عیب کو دیکھے پھر اس کو چھپالے تو گویا اس نے زندہ درگور لڑکی کو زندہ کر دیا۔

## نکاح کا معیار

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تمہاری (لڑکی یا لڑکے) کے بارے میں کوئی رشتہ مل جائے کہ جس کی دینداری اور اخلاق پر تم راضی اور مطمئن ہو تو بلاتاخیر اس سے اپنی اولاد کا نکاح کر دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو زمین کے اندر بڑا فتنہ اور بہت فساد برپا ہوگا۔''

(ترمذی)

فائدہ:

نکاح انسانی زندگی کی ایسی ضرورت ہے جیسے ہوا، پانی وغیرہ۔اسلام نکاح کے سلسلے میں لمبے چوڑے انتظامات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔شریعت اسلامی میں نکاح اس قدر آسان ہے کہ دو شرعی گواہوں کو موجودگی میں ایک مرد اور ایک عورت کو ایک دوسرے کو قبول کر لینا نکاح کو قائم کر دیتا ہے۔اس لیے کہ جس معاشرے میں نکاح عام ہوگا وہاں زنا مشکل اور جہاں معاملہ اس کے برعکس ہوگا تو پھر اس معاشرے میں زنا اور غلط تعلقات کا عام ہوں گے۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکی یا لڑکے کے نکاح کے معیار دین دار اور با اخلاق ہونا قرار فرمایا ہے اور ہدایت فرمائی ہے کہ اگر ایسا رشتہ مل جائے تو نکاح کر دو۔پھر فرمایا اگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ دین کے بجائے حسن صورت، مال و دولت یا اونچے خاندان کو دیکھا اور نکاح میں دیر کی تو اس کے نتیجے میں فتنہ وفساد پیدا ہوں گے۔لڑکے اور لڑکیاں گناہ آلود زندگی گزارنے پر مجبور ہوں گے جس سے والدین اور خاندان معاشرے میں بدنام اور ذلیل ہوں گے، زنا کی کثرت ہوگی اور ان سب کا وبال ان والدین یا سرپرستوں پر پڑے گا جو اس کے ذمہ دار ہیں۔

حضرت حسن بصریؒ سے ایک شخص نے دریافت کیا، حضرت میری لڑکی شادی کے قابل ہے اس کے لیے بہت سے لوگ رشتے کے خواہشمند ہیں اب لڑکے کے انتخاب کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ فرمایا ایسے لڑکے کا انتخاب کرو جس کے دل میں اللہ کا خوف ہو یعنی تقوی اور دینداری ہو اور وہ تمہاری لڑکی سے محبت کرے اور اس کی محبت میں تعظیم واحترام کا پہلو بھی ہو کہ کسی وجہ سے ناراض ہو تو ظلم وزیادتی نہ کرے۔یعنی لڑکا اپنی بیوی سے دین و اخلاق کے لحاظ سے محبت کرنے والا ہو، محبت کا سبب حسن و جمال اور مال نہ ہو کیونکہ جب دین اور اخلاق کی بنیاد پر محبت کا تعلق قائم ہوگا تو اس کے ساتھ احترام وعظمت بھی ہوگی اس لیے غلطیوں اور کوتاہیوں پر تنبیہ تو کرے گا ظلم نہ کرے گا کہ اللہ کے سامنے جواب دہی اس کو ایسا کرنے سے روکے گی۔اور اگر کہیں نکاح اور محبت حسن و مال کی بنا پر ہے تو ان کے جانے سے اس کی محبت میں بھی فرق آئے گا اور جب خوف خدا نہ ہوگا تو پھر ظلم وزیادتی سے اس کو کون سے چیز روکے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدۃ النسا فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں دیا تو اس وقت حضرت علیؓ کے پاس علم وتقوی تھا مگر دنیاوی مال ومتاع سے وہ فارغ تھے یہاں تک کہ رہائش کے لیے مکان تک نہ تھا اور مال میں فقط ایک ذرہ تھی جس کو بیچ کر حق مہر میں ادا کیا۔لیکن وہ مسائل جو آج کل ہمارے گھروں میں عام ہیں ان میاں بیوی میں ان کا نام بھی نہیں تھا۔

ایسا نہیں کہ شریعت اس بات سے روکتی ہے کہ بیٹی کا رشتہ کرنے سے پہلے لڑکے کے مالی حالات کو بالکل پیش نظر نہ رکھا جائے۔مقصد یہ ہے کہ اگر لڑکے کے پاس اتنے وسائل ہوں کے اپنی بیوی کے نان نفقے کا بار اٹھا سکتا ہو تو پھر اس بات کو نہیں دیکھنا چاہیے کہ اس کے پاس گاڑی، بنگلہ اور بینک بیلنس کتنا ہے۔

جب شادی کا بنیادی معیار تقوی اور نیکی ہوگا تب یہ جوہر اور وصف ان کی اولاد میں بھی آئے گا اور اس سے ایک ایسے معاشرے کی بنیاد پڑتی ہے جس کا معیار عزت اور شرف صرف نیکی اور صلاح ہوگا نہ کہ مال و دولت۔**فاعتبروا یا اولی الباب!**

## جنت یا دوزخ

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''جنت تمہاری جوتی کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے اور اسی طرح دوزخ بھی۔''

(بخاری)

فائدہ:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے تمام رسولوں اور پیغمبروں نے اور اس کے نازل کیے ہوئے تمام صحیفوں نے اس حقیقت کو پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور انسان کا دائمی وطن جنت یا دوزخ ہے۔جنت اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت اور فضل وکرم کا

انتہائی مظہر ہے اور اس کی ان جمالی صفات کا پورا پورا ظہور بس وہیں ہوگا اور اسی طرح دوزخ اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا انتہائی مظہر ہے اور ان جلالی صفات کا پورا پورا ظہور بھی وہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور اللہ کی کتابوں نے اس بارے میں جو کچھ انسانوں کو بتلایا بلاشبہ وہ بالکل حق ہے اور بالکل اسی طرح سامنے آنے والا ہے جس طرح کہ انہوں نے بیان فرمایا ہے، اس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ جس طرح نادان بچوں کو ڈرانے دھمکانے یا ان میں کسی چیز کا جذبہ اور شوق پیدا کرنے کے لیے ان کے بڑے بہت سی بے حقیقت باتیں بھی کہہ دیا کرتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور ان کی لائی ہوئی کتابوں نے جنت و دوزخ کے ثواب و عذاب کو بیان کیا ہے یہ بالکل ایسی احمقانہ بات ہے جیسے کہ کوئی کہے کہ ان پیغمبروں نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے یا قیامت کے بارے میں جو کچھ بتلایا ہے وہ بھی بس ڈراوے اور بہلاوے کے لیے ہے ورنہ حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔

قرآن پاک چونکہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اور اس کے بعد کوئی کتاب انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل ہونے والی نہیں کیونکہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے، اس لیے دوسرے مضامین کی طرح اس میں جنت اور دوزخ کا بیان بھی پوری تفصیل کے ساتھ اور اتنی کثرت سے کیا گیا ہے جو کہ انسانوں میں نیک عملی کا جذبہ اور بدعملی سے بچنے کی فکر پیدا کرنے کے لیے یقیناً کافی سے بھی زیادہ ہے بشرطیکہ انسان کا قلب مردہ نہ ہو گیا ہو۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے ارشادات میں اس کے متعلق انتہائی تفصیل کے ساتھ امت کی رہنمائی فرمائی ہے۔

اس حدیث پاک کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی نہ تو جنت اس سے دور ہے اور نہ دوزخ اس سے دور ہے۔ اگر اس کے اعمال اچھے ہیں تو گویا جنت اس کے قریب آگئی ہے، اس کے اور جنت کے درمیان ایک ظاہری حجاب کے سوا اور کوئی چیز حائل نہیں ہے، اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد اس کا قیام جنت کی فضاؤں میں ہی ہوگا، اور اگر اس کے اعمال برے ہیں تو جنت کے بجائے دوزخ اس سے قریب ہے، اس کے اور دوزخ کے درمیان کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے، اگر وہ سنبھلتا نہیں ہے تو کوئی چیز اسے دوزخ میں گرنے سے نہیں بچا سکتی بلکہ جنت اور دوزخ کی اصلیت تو ہمارے اچھے اور برے اعمال ہی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اعمال اور ان کی جزا و سزا میں گہری مناسبت و مماثلت پائی جاتی ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے۔

خبردار! تمام نیکیاں اور بھلائیاں اپنے اطراف و جوانب کے ساتھ جنت میں ہیں، خبردار! تمام برائیاں اپنے اطراف و جوانب کے ساتھ دوزخ میں ہیں، پس تم عمل کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ تمہیں اپنے اعمال کے ساتھ پیش ہونا ہے، تو جو ذرہ بھر بھی کوئی بھلائی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ بھر بھی کوئی برائی کرے گا وہ اسے دیکھ لے (الحدیث)

یہ فقرہ ''جو ذرہ بھر بھی کوئی بھلائی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ بھر بھی کوئی برائی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا'' سورت الزلزال سے ماخوذ ہے۔ یہی بات قرآن پاک میں ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ کے ساتھ آئے ہیں۔

﴿اس دن تم لوگ پیش کیے جاؤ گے، تمہاری کوئی چیز چھپی نہ رہے گی۔﴾ (الحاقہ ۱۸)

## منافق کی قسمیں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''منافق کی تین علامتیں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب اسے امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔''

(بخاری)

فائدہ:

جب بھی کوئی اصلاحی تحریک انقلابی رفتار سے آگے بڑھنے لگتی ہے اور معاشرہ پر اس کا تسلط پھیلتا جاتا ہے تو اس کے متفقین اور مخالفین کے درمیان ایک تیسرا طبقہ بھی پیدا ہو جاتا ہے، یعنی ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس تحریک کے مکمل ہمنوا بن جاتے ہیں اور کامل ذہنی و جسمانی وابستگی کے ساتھ اس کے

دائرہ اثر واطاعت میں داخل ہوجاتے ہیں،ان کے مقابلہ پر دوسرا طبقہ مخالفین کا ہوتا ہے جو تحریک کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے اور اپنی پوری طاقت اور تمام ترو سائل کے ساتھ اعلانیہ طور پر تحریک کے داعیوں اور حامیوں کے مدمقابل رہتا ہے،اور ان دونوں کے درمیان ایک تیسرا طبقہ پیدا ہوتا ہے جو ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو نہ اس تحریک کے دل سے حامی بنتے ہیں اور نہ کھلم کھلا مخالفت کرتے ہیں اس طرح کے لوگ اپنی ذہنی وقلبی وابستگی اپنے سابقہ عقائد ونظریات ہی کے ساتھ رکھتے ہیں لیکن جسمانی طور پر حامیان تحریک کی صفوں میں شامل ہوجاتے ہیں ،یہی صورت حال اسلام کو بھی پیش آئی ،پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے بعد جب مدنی زندگی کا آغاز ہوا اور دعوت اسلام کا ماحول دوسرا ہوگیا دعوت دین کامیابی سے آگے بڑھتی رہی،متفقین اور ہمنواؤں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا،طاقت وشوکت بھی بڑھنے لگی اور سماجی طور پر اہل اسلام کو غلبہ بھی ملنے لگا،لہذا اب اسلام کے مخالفین کو بھی عداوت کی شکل بدل دینی پڑی،انہوں نے یہ مستقل پالیسی بنالی کہ بظاہر تو اسلام کے نام لیوا بن جاؤ اور مسلمانوں کے ساتھ رہنے لگو،مگر اندرونی طور پر مخالفین اسلام یعنی کافروں کے ہمنوا رہو اور خفیہ کاروائیوں کے ذریعہ دعوت اسلام کی راہ میں کانٹے بچھاتے رہو،چنانچہ یہیں سے نفاق کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور اس طرح کے لوگوں کو اسلام میں منافق کہا گیا ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح کسی بھی دعوت کے لیے نفاق سب سے بڑا اڑھن ثابت ہوتا ہے اسی طرح اسلام کے حق میں بھی یہ طبقہ منافقین سب سے زیادہ نقصان رساں ثابت ہوا،ابتداء میں تو ان منافقین کا مکروہ چہرہ مسلمانوں کے سامنے چھپا رہا،لیکن جب ان کی منافقانہ پالیسی اور عیارانہ کاروائیوں نے اسلام اور مسلمانوں کو زیادہ نقصان پہنچانا شروع کیا اور اسلام کے خلاف نقل وحرکت کا علم ہونے لگا تو ان کی شخصیتیں سامنے آنے لگیں اور پھر تو اس طبقہ کی اتنی اہمیت محسوس کی گئی کہ ان کے نام پر مستقل ایک سورت ''المنافقون'' نازل کی گئی،اس کے علاوہ بھی قرآن کریم میں جابجا منافقوں اور ان کی سازشوں اور تباہ کاریوں سے مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے۔

جس طرح ایمان اور کفر کی مختلف قسمیں اور صورتیں ہیں اسی طرح نفاق کی بھی کئی قسمیں ہیں ایک تو اعتقادی نفاق ہے اور یہی حقیقی نفاق ہے یعنی بظاہر اللہ کی توحید،رسالت،فرشتے اور حشر ونشر کے اعتقاد رکھنے کا دعویٰ کرنا مگر اندر ان تمام اعتقاد کا پورا پورا انکار وانحراف کرنا ،یہی وہ نفاق ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تھا،اسی نفاق کو قرآن پاک نے کفر بھی کہا ہے اور اسی نفاق کے بارے میں یہ وعید آئی ہے کہ دوزخ میں منافقین کا ٹھکانہ کافروں سے بھی نیچے ہوگا ، پھر یہ ہوا کہ ان منافقین کے جو عادات وطور طریقے تھے ان پر بھی نفاق کا اطلاق کیا جانے لگا،کیونکہ ان میں سے اکثر باتیں وہی ہیں جو انسان کی اخلاقی اور عملی زندگی کو عیب دار بنادیتی ہیں جو اسلام کی تعلیمات ،اعلیٰ انسانی اقدار اور امانت ودیانت کے صریح منافی ہونے کے سبب ایمان واسلام سے ذرا بھی میل نہیں کھاتیں،چنانچہ جب مسلمانوں کی دینی زندگی میں انحطاط کا دور آیا اور انہوں نے ان باتوں کو اختیار کرنا شروع کردیا جو منافقین اسلام کا خاصہ تھیں تو ارباب اصلاح نے نفاق کی ایک اور قسم متعین کی اور اس کا نام عملی نفاق رکھا۔آج کے دور میں بھی ہم اس منافقت کی عملی شکل کا بخوبی نظارہ کررہے ہیں کہ لوگ بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اندرون خانہ کفار سے مل کر مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار ہیں۔س حدیث پاک میں جس چیز کے خلاف تنبیہ کرنا مقصود ہے اس سے یہی عملی نفاق مراد ہے،مطلب یہ کہ بات چیت میں جھوٹ اختیار کرنا،وعدہ کا پورا نہ کرنا اور امانتوں میں خیانت کرنا ان بری عادتوں میں سے ہیں جو ایک منافق میں تو پائی جاتی ہیں لیکن کسی مومن میں ان کا پایا جانا اعجوبہ سے کم نہیں،لہذا اگر مسلمان دانستہ یا نادانستہ طور پر ان میں سے کسی بری عادت کا شکار ہے تو اس کو فوراً اپنا احتساب کرنا چاہیے اور اس بری عادت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے ورنہ آخرت میں سخت عذاب بھگتنا ہوگا۔

## صلوٰۃ الحاجات

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:''جس شخص کو کوئی حاجت اور ضرورت ہو اللہ تعالیٰ سے متعلق یا کسی آدمی سے متعلق (یعنی خواہ وہ حاجت ایسی ہو جس کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہو،کسی بندے سے اس کا واسطہ ہی نہ ہو،یا ایسا معاملہ ہو کہ بظاہر اس کا تعلق کسی بندے سے ہو) اس کو چاہیے کہ وہ وضو کرے اور خوب اچھا وضو کرے،اسکے بعد دو رکعت نماز پڑھے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کچھ حمد وثناء کرے اور اس کے نبی علیہ السلام پر درود پڑھے،پھر اللہ کے حضور میں اس طرح عرض کرے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ ❖ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ❖ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ❖ اَسْئَلُکَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِکَ وَ عَزَائِمَ مَغْفِرَتِکَ وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَّ السَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ ❖ لَا تَدَعْ لِیْ ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ وَ لَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ وَ لَا حَاجَةً هِیَ لَکَ رِضًی اِلَّا قَضَيْتَهَا يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ ❖

(اللہ کے سوا کوئی مالک و معبود نہیں ،وہ بڑے حلم والا اور بڑا کریم ہے، پاک و مقدس ہے وہ اللہ جو عرش عظیم کا بھی رب اور مالک ہے، ساری حمد و ستائش اس اللہ کے لیے جو سارے جہانوں کا رب ہے، اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ان اعمال اور ان اخلاق و احوال کا جو تیری رحمت کا موجب اور وسیلہ اور تیری مغفرت اور بخشش کا پکا ذریعہ بنیں اور تجھ سے طالب ہوں ہر نیکی سے فائدہ اٹھانے اور حصہ لینے کا ،اور ہر گناہ اور معصیت سے سلامتی اور حفاظت کا، یا اللہ! میرے سارے ہی گناہ بخش دے اور میری ہر فکر اور پریشانی دور کردے اور میری ہر حاجت جس سے تو راضی ہو اس کو پورا فرما دے، اے ارحم الرحمین، سب مہربانوں سے بڑے مہربان)۔''

(ترمذی و ابن ماجہ)

فائدہ:

یہ ایک حقیقت ہے جس میں کسی مومن کے لیے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ مخلوقات کی ساری حاجتیں اور ضرورتیں اللہ کے اور صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں، اور بظاہر جو کام بندوں کے ہاتھوں سے ہوتے دکھائی دیتے ہیں دراصل وہ بھی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور اسی کے حکم سے انجام پاتے ہیں اور صلوٰۃ الحاجات کا جو طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں تعلیم فرمایا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجتیں پوری کرانے کا بہترین طریقہ ہے اور جن بندوں کو ان ایمانی حقیقتوں پر یقین نصیب ہے ان کا یہی تجربہ ہے اور انہوں نے صلوٰۃ الحاجات کو اللہ کے خزانوں کی کنجی پایا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ان حاجتوں کے لیے بھی صلوٰۃ الحاجات تعلیم فرمائی ہے جن کا تعلق بظاہر کسی بندے سے ہو، مثلاً کسی نوکری کی خواہش ہو، یا کسی سے نکاح کرنا چاہتا ہو یا ایسی کوئی اور ضرورت ہو جسے کسی شخص سے پورا کرنا مقصود ہو، اس کا ایک خاص فائدہ یہ بھی ہے کہ جب بندہ اپنی ایسی حاجات کے لیے صلوٰۃ الحاجات پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا کرے گا تو اس کا یہ عقیدہ و یقین اور زیادہ مستحکم ہو جائے گا کہ کام کرنے اور بنانے والا دراصل وہ بندہ نہیں ہے اور نہ اس کے کچھ اختیار میں ہے بلکہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ بندہ اللہ تعالیٰ کا صرف آلہ کار ہے اس کے بعد جب وہ کسی بندے کے ہاتھ سے کام ہوتا ہوا بھی دیکھے گا تو اس کے توحیدی عقیدے میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

اپنی ہر طرح کی حاجتوں کے لیے نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنا قرآن پاک سے بھی ثابت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرو صبر اور نماز کے ذریعہ۔﴾ (البقرہ ۱۵۳)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ یہی معمول تھا کہ جب بھی آپ کو کوئی پریشانی لاحق ہوتی یا کوئی اہم معاملہ درپیش آتا تو آپ نماز میں مشغول ہو جاتے تھے، بلا شبہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت حاصل ہے اور دنیا کا کوئی بھی کام اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا، ایک مومن کا یہ طریقہ ہونا چاہیے کہ ہر کام کے لیے صحیح طریقہ پر پوری کوشش کرے اور یہ یقین رکھے کہ میری تمام تدبیروں کو کامیاب یا ناکام کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے پھر اسی سے اپنے کام کے بننے کی درخواست کرے، جو شخص پورے یقین و اعتماد کے ساتھ صلوٰۃ الحاجات کو اپنا معمول بنالیتا ہے وہ صاف طور پر اس کے فوائد و برکات کا مشاہدہ کرلیتا ہے، امت کے تمام نیک لوگوں نے اپنی مشکلات کے دور کرنے اور ضروریات کو پورا کرانے میں صلوٰۃ الحاجات کو اکسیر پایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کا جو حکم فرمایا گیا ہے اس کے لیے سورۃ فاتحہ اور نماز والا درود کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی ہر طرح کی حاجات اور ضروریات کے لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

## شرابی کی سزا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے شراب پی تھی، آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہم سے) فرمایا کہ: ''اس کی پٹائی کرو۔'' چنانچہ ہم میں سے بعض نے اپنے ہاتھوں سے، بعض نے اپنے کپڑے (کا کوڑا بنا کر اس) سے اور بعض نے اپنی جوتیوں سے اس کی پٹائی کی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''(اب زبان سے) اس کو تنبیہ کردو اور عار دلاؤ۔'' چنانچہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے کہنا شروع کیا کہ تو نے اللہ کی مخالفت سے اجتناب نہیں کیا، تو اللہ سے نہیں ڈرا اور تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کے سامنے آنے) سے بھی نہ شرمایا اور پھر (جب) بعض لوگوں نے یہ کہا اللہ تعالیٰ تجھ کو (دنیا و آخرت دونوں جگہ یا آخرت میں) ذلیل و رسوا کرے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''اس طرح نہ کہو اور اس پر شیطان کے غالب ہوجانے میں مدد نہ کرو بلکہ یوں کہو کہ اے اللہ! (اس کا گناہ مٹا کر) اس کو بخش دے اور (اس کو طاعت و نیکی کی توفیق عطا فرما کر) اس پر رحم کر (یا اس کو دنیا میں بخش دے اور عاقبت میں اس پر اپنا رحم فرما)۔''

(ابوداؤد)

فائدہ:

شراب جس کو ام الخبائث یعنی تمام برائیوں کی جڑ کہا گیا ہے اسلام سے پہلے بھی عربوں میں جزو زندگی کا درجہ رکھتی تھی اور ابتداء اسلام میں بھی اس کا رواج باقی رہا لیکن اس کی برائی اور اور اس کے نقصان کی وجہ سے مسلمانون کے دل میں کھٹک بھی پیدا ہوتی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کے مطابق یہ شراب مال کو بھی برباد کرتی ہے اور عقل کو بھی ختم کرتی ہے کے پیش نظر لوگوں میں یہ احساس بھی روز بروز بڑھتا جاتا تھا کہ اس کی اباحت جتنی جلدی ختم ہوجائے اتنا ہی اچھا ہے، ادھر چونکہ سوسائٹی اس لعنت میں گرفتار تھی اور یہ ایک ایسی عادت تھی جس کی جڑیں پورے معاشرہ میں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں اس لیے مصلحت شریعت یہ تھی کہ اس کی حرمت کا نفاذ دفعتاً کرنے کی بجائے بتدریج روبہ عمل لایا جائے اور عام لوگوں کے دلوں میں اس کی نفرت اس طرح پیدا کی جائیں کہ شریعت کا مقصد بھی پورا ہوجائے اور لوگ اس لعنت سے نجات بھی پا جائیں چنانچہ جب کچھ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کے بارے میں دریافت کیا تو اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور (بظاہر) ان میں لوگوں کے لیے کچھ فائدے ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدوں سے بہت بڑھا ہوا ہے۔﴾ (البقرہ ۲۱۹)

جو لوگ پہلے ہی سے شراب کے نقصان دہ اثرات کا احساس رکھتے تھے اور جو لوگ اس کی برائی سے طبعاً بیزار تھے ان کے لیے تو بس اتنا ہی کافی تھا کہ قرآن کریم نے شراب کو گناہ کہہ دیا لہٰذا انہوں نے شراب نوشی قطعاً ترک کردی، لیکن چونکہ اس آیت میں شراب کی حرمت کا کوئی واضح اور قطعی حکم نہیں ہے اس لیے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے شراب نوشی کا مشغلہ بدستور جاری رکھا اور پھر اس سلسلہ میں یہ دوسری آیت نازل ہوئی۔ ﴿اے ایمان والو! تم ایسی حالت میں نماز کے پاس مت جاؤ کہ تم نشہ کی حالت میں مست ہو، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہتے ہو۔﴾ (النساء ۴۳)

اس آیت نے شراب نوشی کے جاری مشغلہ پر ایک اور ضرب لگائی اور نماز کے اوقات میں شراب نوشی بالکل ترک کردی گئی، البتہ نماز کے علاوہ اوقات میں بعض لوگوں کے یہاں اب بھی شراب نوشی کا مشغلہ بند نہیں ہوا اور آخر کار ۳ ہجری میں یہ تیسری آیت نازل ہوئی جس میں حرمت شراب کو واضح کردیا گیا۔ ﴿اے ایمان والو! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شراب اور جوا اور بت اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی چیزیں شیطانی کام ہیں سو ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔﴾ (المائدہ ۹۰)

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد شراب نوشی بالکل بند ہوگئی، شراب کے مٹکے توڑ دیے گئے اور شراب مدینہ کی گلیوں میں گندے پانی کی طرح بہنے لگی اور شراب کی حرمت کا حکم نافذ ہوا۔

اس حرمت کے حکم کے بعد جب ایک شخص جس نے شراب کا نشہ کیا تو اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے تنبیہ کرنے کا جو حکم دیا وہ استحباب کے طور پر تھا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا حکم (کہ اس کی پٹائی کرو) وجوب کے طور پر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا اس پر شیطان کے غالب ہوجانے میں مدد نہ کرو کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کی بددعا کر کے شیطان کی اعانت نہ کرو کیونکہ جب اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل و رسوا کردے گا تو اس پر شیطان کا تسلط ہوجائے گا یا جب وہ تم کو یہ بددعا کرتے ہوئے سنے گا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید و

مایوس ہو جائے گا اور یہ مایوسی و نا امیدی اس کو گناہوں میں منہمک رکھے گی اس طرح اس پر اپنا غلبہ رکھنے کا شیطان کا مقصد بھی پورا ہوگا اور اس کا گناہوں پر اصرار و تکرار اللہ کے غضب کا سبب بھی ہوگا لہذا اس اعتبار سے تمہاری بددعا شیطان کے بہکانے میں مددگار ہوگی۔اور پھر فرمایا کہ اب اس کے لیے دعائے مغفرت و رحمت کرو۔

## مغرب اور فجر کی نماز کے بعد کی خاص دعا

حضرت حارث بن مسلم تمیمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد مکرم سے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (مسلم تمیمی) سے چپکے سے فرمایا کہ:''جب تم مغرب کی نماز سے فارغ ہو جاؤ تو تم کسی سے کوئی کلام و گفتگو کرنے سے پہلے سات مرتبہ یہ کہو اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ (اے اللہ! مجھے دوزخ کی آگ سے پناہ دے) اور اگر تم اس کلمہ کو کہو اور پھر اس رات میں تمہارا انتقال ہو جائے تو تمہارے لیے دوزخ سے نجات لکھی جائے گی اور اسی طرح جب تم صبح (فجر) کی نماز پڑھو اور اسی طرح کہو (یعنی کسی سے کوئی کلام یا گفتگو کرنے سے پہلے سات مرتبہ اس دعا کو پڑھو) اور پھر اس دن تمہارا انتقال ہو جائے تو تمہارے لیے دوزخ سے نجات لکھی جائے گی۔''

(ابوداؤد)

<u>فائدہ:</u>

دعا مانگنا ایک مکمل عبادت ہے جیسا کہ قرآن پاک میں واضح طور پر اس طرح حکم آیا ہے۔

﴿تمہارے رب کا فرمان ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا یقین مانو کہ جو لوگ میری عبادت سے خودسری کرتے ہیں وہ ابھی ابھی ذلیل ہو کر جہنم میں پہنچ جائیں گے۔﴾ (المومن ۶۰)

اس آیت سے یہ بات اچھی طرح سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ دعا عین عبادت اس لیے ہے کہ قلب کی پوری توجہ اور اخلاص کے ساتھ ہاتھ پھیلانے ،گڑگڑانے اور دعا مانگنے مین بندگی کا کامل ترین اظہار ہوتا ہے،اس لیے کوئی عبادت بھی دعا سے خالی نہیں ہے اسی لیے آیت مبارکہ میں دعا کی ضرورت کو واضح کرنے کے لیے دعا کو عین عبادت اور دعا سے روگردانی کرنے کو عبادت سے سرتابی قرار دیا گیا ہے۔چنانچہ دعا صرف اللہ رب العزت سے کرنی چاہئے کہ وہی حقیقی کارساز اور مشکل کشا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت و فضل کے طلب کی دعا کرتے رہنا چاہیے،اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت و حمایت کا وعدہ انسان کے اعمال کے ساتھ منسلک کر رکھا ہے،اگر اعمال صالحہ اس حد تک نہ پہنچیں اور بداعمالیاں درمیان میں رکاوٹ بن جائیں تو اللہ تعالیٰ کی نصرت کے وعدوں کو پورا کرنے میں دعا کام آتی ہے اور ایسے اسباب کو پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے جن اسباب کے ہوتے ہوئے نصرت و حمایت الٰہی کا آنا لازم ٹھہرتا ہے،اس کے ساتھ دعا ان اسباب کو پیدا کرنے سے روکتی ہے جو اس کے لیے رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔

دعا پوری توجہ اور یکسوئی اور حضور قلب سے مانگنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے اچھی امید رکھیے اور اپنے گناہوں کے انبار پر نگاہ رکھنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے بے پایاں عفو و کرم اور بے حد و بے حساب جود و سخا پر نظر رکھیے اس شخص کی دعا درحقیقت دعا ہی نہیں ہے جو غافل اور لاپرواہ ہو اور لاشعوری کے ساتھ محض نوک زبان سے کچھ الفاظ بے دلی کے ساتھ ادا کر رہا ہو۔

جیسا کہ ایک روایت میں اس طرح آتا ہے کہ اپنی دعاؤں کے قبول ہونے کا یقین رکھتے ہوئے (حضور قلب سے) دعا کیجیے،اللہ تعالیٰ ایسی دعا کو قبول نہیں فرماتے جو غافل اور بے پرواہ دل سے نکلی ہو۔(بحوالہ ترمذی)

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی آسانی کے لیے ہر موقع کی خاص دعائیں ہدایت فرمائی ہیں اور ان دعاؤں کی فضیلتیں بھی واضح فرما دی ہیں تاکہ امت ان کا اہتمام کرنے میں کسی بھی قسم کی کاہلی سے گریز کرے۔اس اہتمام سے ایک فائدہ تو اتباع سنت کا ہے دوسرے جن الفاظ و معانی سے یہ دعائیں معمور ہیں وہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

ذرا غور کریں اس حدیث پاک کی دعا انتہائی مختصر ہونے کے باوجود بڑی عظیم اور اہم دعا ہے، ہر مسلمان کی یہ دلی خواہش ہے کہ وہ جہنم کی آگ سے محفوظ رہے اور جنت اس کا مقدر بنے اور اسی جہنم کی آگ سے بچنے کے لیے رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اہم دعا کی تلقین فرمائی ہے کہ اس مختصر سے عمل کو کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جہنم کی آگ سے محفوظ رہے گا۔اس غیر معمولی اہتمام کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تلقین کے بعد اس دعا کا اہتمام نہ کرنا بڑی ناقدری اور کم نصیبی کی بات ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔آمین۔